اردو شاعروں کا البم
مرتبہ زیدی دہلوی
غالب بک ڈپو گنپت روڈ لاہور
www.urduchannel.in

اُردو شاعروں کا البم

مرتبہ زیدی دہلوی

ناشران
غالب بُک ڈپو۔ گنپت روڈ۔ انارکلی لاہور

اختر عباس کے نام

فہرست شعراء

نام شاعر	پیدائش	وفات	عمر	صفحہ	نام شاعر	پیدائش	وفات	عمر	صفحہ
امیر خسرو دہلوی	۱۲۵۳ء	۱۳۲۴ء	۷۱	۳	خواجہ حالی	۱۸۳۷ء	۱۹۱۴ء	۷۷	۲۷
محمد قلی قطب شاہ	۱۵۶۳	۱۶۱۱	۴۸	۵	اکبر الہ آبادی	۱۸۴۶	۱۹۲۱	۷۵	۲۸
ولی دکنی	۱۶۶۸	۱۷۴۴	۷۴	۶	شاد عظیم آبادی	۱۸۴۶	۱۹۲۷	۸۱	۲۹
میرزا رفیع سودا	۱۷۱۳	۱۷۸۰	۶۷	۷	ریاض خیرآبادی	۱۸۵۳	۱۹۳۴	۸۱	۳۰
میر درد	۱۷۲۰	۱۷۸۴	۶۴	۸	صفی لکھنوی	۱۸۶۲	۱۹۵۰	۸۸	۳۱
میر تقی میر	۱۷۲۲	۱۸۱۰	۸۸	۱۰	سائل دہلوی	۱۸۶۸	۱۹۴۵	۷۷	۳۲
میر حسن	۱۷۲۷	۱۷۸۶	۵۹	۱۱	امجد حیدرآبادی	۱۸۶۸	—	۸۴	۳۳
نظیر اکبرآبادی	۱۷۳۵	۱۸۳۰	۹۵	۱۲	فصاحت جنگ جلیل	۱۸۶۹	۱۹۴۶	۷۷	۳۴
مصحفی	۱۷۵۰	۱۸۲۴	۷۴	۱۳	سرور جہان آبادی	۱۸۷۳	۱۹۱۰	۳۷	۳۵
سید انشا	۱۷۵۶	۱۸۱۷	۶۱	۱۴	علامہ اقبال	۱۸۷۳	۱۹۳۸	۶۵	۳۶
خواجہ آتش	۱۷۷۸	۱۸۴۶	۶۸	۱۵	حسرت موہانی	۱۸۷۸	۱۹۵۱	۷۳	۳۸
ناسخ	۱۷۸۷	۱۸۳۸	۵۱	۱۶	فانی بدایونی	۱۸۷۹	۱۹۴۰	۶۱	۳۹
ابراہیم ذوق	۱۷۸۹	۱۸۵۴	۶۵	۱۷	سیماب اکبرآبادی	۱۸۸۰	۱۹۵۱	۷۱	۴۰
مرزا غالب	۱۷۹۶	۱۸۶۹	۷۳	۱۹	برج نرائن چکبست	۱۸۸۲	۱۹۲۶	۴۴	۴۱
مومن	۱۸۰۰	۱۸۵۱	۵۱	۲۰	عزیز لکھنوی	۱۸۸۲	۱۹۳۵	۵۳	۴۲
میر انیس	۱۸۰۱	۱۸۷۴	۷۳	۲۲	اصغر گونڈوی	۱۸۸۴	۱۹۳۶	۵۲	۴۳
میرزا دبیر	۱۸۰۳	۱۸۷۵	۷۲	۲۳	جگر مرادآبادی	۱۸۹۰	—	۶۲	۴۴
دیا شنکر نسیم	۱۸۱۱	۱۸۴۳	۳۲	۲۴	جوش ملیح آبادی	۱۸۹۴	—	۵۸	۴۵
امیر مینائی	۱۸۲۸	۱۹۰۰	۷۲	۲۵	رضا علی وحشت	۱۸۹۴	—	۵۸	۴۶
فصیح الملک داغ	۱۸۳۱	۱۹۰۵	۷۴	۲۶	حفیظ جالندھری	۱۹۰۰	—	۵۲	۴۷

اختر شیرانی ۱۹۰۵ء - ۱۹۴۸ء عمر ۴۳ سال صفحہ ۴۸

قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے

تقریظ۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدظلہ

انجمن ترقی اردو پاکستان

اسپتال روڈ۔ کراچی

بخدمت جناب سید زوار حسین زیدی صاحب سلمہٗ

غالب بک ڈپو۔ نسبت روڈ۔ انارکلی۔ لاہور

۱۵ اگست ۱۹۵۲ء

مکرمی تسلیم

اردو شاعروں کا البم اور انتخاب غالب پہنچا۔ ان نفیس تحفوں کے لیے دل سے شکر گزار ہوں۔ جس حسن و خوبی اور شوق کے ساتھ آپ نے یہ البم شائع کیا ہے یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ نفاست ذوق آپ پر ختم ہے۔

مخلص

عبدالحق

تقریظ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

۱۳ ر مارچ ۱۹۵۲ء

انجمن ترقیِ اردو پاکستان۔ کراچی

سید زوار حسین زیدی صاحب نے ۱۹۳۹ء میں
دہلی سے "مصنفین اردو با تصویر" اور ۱۹۴۰ء میں
"اردو شاعروں کا البم" شائع کیا تھا۔
اب وہ پاکستان سے دوبارہ شاعروں کا البم
شائع کر رہے ہیں۔ ہر صفحہ پر ایک شاعر کا تذکرہ
اور اس کی تصویر ہے۔ اس البم کی ترتیب و تدوین
میں بھی زیدی صاحب نے ذوقِ سلیم سے کام لیا ہے۔
کتابت و طباعت کی نفاست کے لحاظ سے بھی بہتر ہے۔
مجھے امید ہے کہ یہ البم اہلِ ذوق میں مقبول ہوگا۔
اب وہ مصنفین اردو با تصویر شائع کرنے والے ہیں
زیدی صاحب کو ان کاموں کا بہت اچھا سلیقہ اور ذوق ہے
وہ نقش اول تھا یہ نقش ثانی ہوگا اس لیے توقع ہے کہ یہ
پہلے نقش سے زیادہ نفیس اور خوب صورت ہوگا۔

Kuldip Narain Tikku

امیر خسروؔ دہلوی

ابوالحسن نام، خسروؔ تخلص۔ ۱۲۵۳ء/۶۵۱ھ میں مقام پٹیالی (صوبہ آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد امیر سیف الدین محمود شمسی ترکوں کے ایک قبیلے لاچین سے تھے۔ چنگیز خاں کے حملہ ۱۲۱۹ء/۶۱۶ھ کے بعد سلطان شمس الدین التمش کے عہد سلطنت میں بلخ سے ہندوستان آئے اور شاہی اعزاز و اکرام سے سرفراز ہوئے۔ امیر خسروؔ کے نانا عماد الملک شاہ بلبن کے وزیر جنگ تھے۔ امیر خسروؔ کی عمر نو سال کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ نانا کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت پائی۔ بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ انیس سال تک کا فارسی کلام "تحفۃ الصغر" میں موجود ہے۔ بیس سال کی عمر میں تمام علوم سے فارغ ہو گئے۔ خوش قسمتی سے شاہزادہ محمد ولی عہد سلطان غیاث الدین بلبن جیسا مربی مل گیا۔ اور اسی وسیلے دربار شاہی میں باریابی حاصل ہوئی۔ امیر خسروؔ نے بلبن سے محمد تغلق تک گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کے درباروں میں معزز عہدوں پر فائز رہے۔ سلطان جلال الدین خلجی نے اُن کے علم و فضل کی اس درجہ قدر دانی کی کہ انھیں "ندیم خاص" بنایا، اور "مصحف داری" اور "امارت" کا عہدہ دیا۔ اور "امیر لاچین" کا موروثی فوجی منصب بھی عطا کیا، جس کے سبب خسروؔ کو "امیر" کا خطاب ملا۔

امیر خسروؔ ایک جید عالم، بے مثل ادیب اور بے بدل شاعر تھے۔ انھیں عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں پر پوری قدرت اور فن موسیقی میں خاص مہارت تھی۔ طبیعت بلا کی موجد اور مخترع پائی تھی۔ راگ راگنیوں میں اَن گنت اختراعیں کیں۔ فارسی شاعری میں ایسا کمال دکھایا کہ "طوطیِ ہند" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں:۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اردو الفاظ کے استعمال اور انھیں شعر کے قالب میں ڈھالنے کی سب سے پہلے امیر خسروؔ نے کوشش کی۔ اُن کے ہاں ایسے الفاظ بکثرت ملتے ہیں جن کا ایک مصرع فارسی اور دوسرا اردو ہے۔ امیر خسروؔ کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ اُن کے فارسی اشعار کا اندازہ لاکھوں تک کیا گیا ہے۔ اُن کا ہندی کلام بھی فارسی کے کلام سے کم نہ تھا۔ لیکن ہم تک نہ پہنچ سکا۔ انھوں نے جملہ اصنافِ سخن یعنی غزل، مثنوی، قطعہ، مرثیہ، کہہ مکرنیاں، انمل، دو سخنے اور قسم قسم کے گیتوں اور پہیلیوں میں اپنے کمال کے جوہر نمایاں کیے ہیں۔

امیر خسروؔ کے نانا اور والد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔ اس لیے انھوں نے بھی آٹھ سال کی عمر میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے دامن میں پناہ لی۔ مرشد کو اپنے پیر سے یہ لگاؤ تھا کہ اکثر فرمایا کرتے تھے "ترکِ من از وجودِ خود بہ تنگم لیکن از تو نہ تنگم"۔ امیر خسروؔ کی شاعرانہ عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ خود سلطان الاولیا حضرت محبوب الٰہیؒ نے اُن کی مدح فرمائی ہے:

خسروؔ کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست ملکیتِ ملکِ سخن آں خسروؔ راست

آں خسروؔ ماست، ناصر خسروؔ نیست زیرا کہ خدائے ناصرِ ایں خسروؔ ماست

۱۳۲۴ء/۲۵ میں جب حضرت محبوب الٰہیؒ نے رحلت فرمائی تو امیر خسرو محمد تغلق کے ہمراہ بنگالہ کی مہم پر گئے ہوئے تھے کسی خاص کیفیت کے ماتحت بادشاہ سے اجازت لے کر یکایک دہلی پہنچے اور مُرشد کے وصال کی خبر سُنی۔ اُسی وقت تمام دولت و ملکیت مُرشد کے ایصالِ ثواب کے لئے فقراء و مساکین میں تقسیم کر دی۔ ماتمی لباس پہن کر مزار پُر انوار پر پہنچے۔ آستانہ سے سر ٹکرا کر ایک چیخ ماری کہ "سبحان اللہ آفتاب در زیرِ زمین و خسرو زندہ" یہ کہہ کر بیہوش ہو گئے جب ہوش آیا تو یہ شعر پڑھا اور رُوح پرواز کر گئی۔

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارو کیس   چل خُسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چہو دیس

حضرت محبوب الٰہیؒ کی پائنتی دفن کئے گئے مہدی خواجہ نے سب سے پہلے ۱۴۹۱ء/۸۹۶ھ بعہد بابر بادشاہ مقبرہ تعمیر کرایا

دھڑی) سب کوئی اُس کو جانے ہے، پر ایک نہیں پہچانے ہے   آٹھ دھڑی میں بکتا ہے، نگر کیا آن دیکھا ہے

(اُردو کی سب سے پہلی غزل)

زحالِ مسکیں مکن تغافل، دورائے نیناں بنائے بتیاں   کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ   سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو، بصد فریبم ببرد تسکیں   کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں، چو ذرہ حیراں، ز مہر آں مہ بگشتم آخر   نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحق روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو   سپیت منکے درائے راکھوں جو جائے پاؤں پی کی کھتیاں

گفتم تو کہ در حسن و لطافت چو مہی   آں دیگ دہی بر سر تو چترِ شہی
از ہر دو لبت شہد و شکر می ریزد   ہر گاہ بگوئی کہ دہی لیہو دہی
یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من   بے گنہ ہم ساتھ عجب روٹھ ہے   (روٹھا ہے)
روئے تو رونق شکنِ آفتاب   سرو بہ پیشِ قدِ تو بوٹہ ہے   (بوٹا ہے)
کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا   آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

(پہیلی)

سر کاٹوں تو من بسے اور پاؤں کاٹوں تو پیالا   امیر خسرو یوں کہے رنگ ہے اُس کا کالا

(جامن)

بیسوں کا سر کاٹ لیا   نا مارا نا خون کیا   (ناخن)

(دو سخنے)

انار کیوں نہ چکھا   وزیر کیوں نہ رکھا   (دانا نہ تھا)
گوشت کیوں نہ کھایا   ڈوم کیوں نہ گایا   (گلا نہ تھا)

محمد قلی قطب شاہ

نھی جساں زلی پہ ہوئی کیا نظر
خبر سب گنوا کر ہوا بے خبر

پیا باج پیالا، پیا جائے نا
پیا باج یک تِل جیا جائے نا

خورشید مکھ اُپر دسے ابرو ہلالِ عید
اس ابرواں کو سجدہ کیا ہے وصالِ عید

صدا تو مدحِ نبیؐ و علیؑ کی کہتا ہے
معانی شعر ترا تو لکھے ہیں دست بدست

سلطان محمد قلی قطب شاہ، والیِ گولکنڈہ ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء میں اپنے والد محمد ابراہیم قطب شاہ کی وفات پر بعہدِ اکبر بادشاہ تخت نشین ہوئے اور ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں انتقال کیا۔ یوں تو دکن میں علمی اور ادبی سرگرمیوں کا آغاز آٹھویں صدی ہجری سے ہو چکا تھا لیکن شاہانِ گولکنڈہ کا دور، اُردو ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے خصوصاً سلطان محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ اِس دور کے مشہور شعراء و ادباء اُن کے دربار میں جمع تھے۔ قلی قطب شاہ کو شعر و شاعری کے علاوہ فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر سے بھی خاص شغف تھا۔ دکھنی، تلنگی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ قطب شاہ و معانی تخلص تھا۔ ایک ضخیم دیوان اُن کی یادگار ہے جس کا سہرا اب تک عدمِ تحقیق کی وجہ سے ولی کے سر تھا۔ علاوہ اُن چند شاعروں کے جن کا رتبہ دُنیائے شاعری میں بہت بلند ہے۔ قلی قطب شاہ کا کلام بلحاظِ زبان کے تغیر و شستگی کے کسی دوسرے شاعر سے کم نہیں۔ عشق، سرمستی اور تصوف سے کلام معمور ہے۔ اُن کے کلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت جو زمانہ مابعد کے شعراء میں سودا اور نظیر کے سوا کسی دوسرے کے یہاں نظر نہیں آتی، یہ ہے کہ وہ نہ صرف اُردو شاعرِ اوّلیں ہیں جنھوں نے اُردو میں غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ لکھا، بلکہ اس محدود دائرے سے نکل کر آزاد روی اور جدت کا مسلک اختیار کیا۔ اپنے مشاہدات کو کلام میں لا کر انسانی معاشرت اور مناظرِ قدرت پر بھی نظر ڈالی۔ اِن کی مثنویوں میں جہاں پھولوں، میووں، سبزی ترکاری اور شکاری پرندوں کا بیان ہے، وہاں شاہی محلوں، شادی بیاہ، سالگرہ کی تقاریب، شب برات، عید، ہولی، دیوالی وغیرہ تہواروں کا بھی ذکر موجود ہے۔ وہ اگر ایک طرف فارسی اور عربی کے الفاظ اور تراکیب بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں تو دوسری طرف اُن کے کلام میں ہندی کا عنصر بھی شامل ہے۔ وہ ہندی الفاظ، ترکیبیں، استعارے اور تشبیہیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے وسیع النظری سے کام لے کر اُردو کو ایک ادبی زبان بننے کے قابل بنایا۔

ولی دکنی

خال بھی مکھ پر ترے جو یوں دسے
جیوں کہ بیٹھا زاغ آ گلشن بھیتر

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو
کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی
کہ دل تے تاب، جی سے صبر، سر سے ہوش لے جاوے

ولی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

تری یہ زلف ہے شامِ غریباں
جبیں تیری مجھے صبحِ وطن ہے

طاقت نہیں کسی کو جو اک حرف سن سکے
احوال کیا کہوں میں، دلِ بے قرار کا

ترک کر اے رقیب فرعونی
آہ، میری، عصائے موسیٰ ہے

اردو زبان کے محسن ولی محمد المتخلص بہ ولی ۱۶۶۸ء/۱۰۷۹ھ میں بمقام اورنگ آباد، دکن پیدا ہوئے۔ اور ۱۷۴۲ء/۱۱۵۵ھ میں احمد آباد (گجرات) میں وفات پائی۔ بیس برس کے سن میں تحصیلِ علم کے لئے گجرات گئے جو اس زمانے میں علوم و فنون کا مرکز تھا۔ اور شاہ وجیہ الدین علوی کے مدرسہ میں تعلیم پائی۔ وہیں شاہ نورالدین صدیقی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سیر و سیاحت کے سلسلے میں دو مرتبہ دلی آئے۔ پہلی بار اورنگ زیب عالمگیر کے آخری عہد ۱۷۰۰ء/۱۱۱۲ھ میں اور دوسری دفعہ محمد شاہ کے دورِ سلطنت ۱۷۲۳ء/۱۱۳۵ھ میں۔ پہلی بار شاہ سعد اللہ گلشن، دہلی کے مشہور شاعر و درویش کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کے فارسی کلیات میں دو لاکھ کے قریب شعر تھے۔ انھوں نے ولی کو مشورہ دیا کہ ریختہ میں فارسی کے مضامین رنگین استعمال کریں۔ جب دوسری مرتبہ دلی آئے تو اپنا دیوان ساتھ لائے۔ چونکہ شاہ گلشن کے مشورے سے پورا استفادہ کر چکے تھے ان کا کلام دلی میں مقبول ہوا۔ ولی کے اردو شعراء کے کلام میں فارسیت غالب تھی، لیکن ولی نے فارسی کے ساتھ بھاشا الفاظ کو اپنے کلام میں سمو کر ایک نئے دور کی داغ بیل ڈالی۔ انھوں نے ہر صنفِ سخن اور مختلف زمینوں اور بحروں میں دادِ سخن دی ہے لیکن ان کے کلام میں تغزل کا رنگ غالب ہے۔ ان کا دور اردو زبان کا ایک عبوری دور ہے اہلِ دکن اور اہلِ شمال کے میل جول سے نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے الفاظ زبان میں داخل ہونے لگے۔ ولی نے اس دور کی زبان کو اپنے کلام میں محفوظ کر کے ایک تاریخی فرض انجام دیا۔ الفاظ کی موزونی، ان کا برمحل استعمال، اچھوتے استعارے اور تشبیہیں، جاذبِ نظر ترکیبیں اور رعایاتِ لفظی کلامِ ولی کی جان ہیں۔

میرزا رفیع سودا

(قصیدہ)

آبِ جو گردِ چمن لمعۂ خورشید سے ہے
خطِ گلزار کے صفحے پہ طلائی جدول

فیضِ تاثیرِ ہوا یہ ہے کہ آبِ حنظل سے
شہد ٹپکے جو لگے نشترِ زنبورِ عسل

نسبت اس فصل کو، پر کیا ہے سخن سے میرے
ہے فضا اس کی تو دو چار ہی دن میں فیصل

اے لالہ، گو فلک نے دیئے، تجھ کو چار داغ
چھاتی مری سراہ، کہ اک دل ہزار داغ

رنگِ گل کچھ بے طرح دہکے ہے اے ابرِ بہار
آشیاں میرا بچا لگتی ہے اب گلشن میں آگ

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

سمجھ کے رکھیو قدم، دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا!

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی!

میرزا محمد رفیع نام، سودا تخلص۔ ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ والد مرزا محمد شفیع بسلسلۂ تجارت کابل سے ہندوستان آئے اور دلی میں قیام کیا۔ سودا نے لائق استادوں سے تعلیم حاصل کی۔ بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ پہلے سلیمان قلی وداد، پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ خانِ آرزو سے بھی کسبِ فیض کیا اور انہی کے مشورے سے اردو میں مشقِ سخن شروع کی۔ طبیعت میں شوخی اور جودت تھی۔ بہت جلد شہرت کا غلغلہ بلند ہوا۔ نواب شجاع الدولہ کے طلب کرنے پر ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء میں فیض آباد گئے۔ نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ نے بڑی قدر کی۔ سودا ۱۱۹۳ھ میں آصف الدولہ کے ہمراہ فیض آباد سے لکھنؤ آئے اور وہیں ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء میں انتقال کیا۔

میرزا سودا نے قریب قریب تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن جس چیز کے سبب وہ زیادہ مشہور ہوئے وہ اُن کے قصائد ہیں۔ میرزا کی طبیعت میں ظرافت کا عنصر غالب تھا اور فطرتاً ہجو گوئی کے لئے موزوں تھے۔ غزل کے بھی وہ ایک بڑے استاد ہیں۔ اُن کا کلام درد، سوز و گداز اور خستگی سے خالی نہیں ہے، اور یہ وہ صفتیں ہیں جو غزل سرائی کی جان ہیں۔

میر درد

دین و دُنیا میں تو ہی ظاہر ہے
دونوں عالم کا ایک عالم ہے

اِن لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

دِل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا

دِل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

سینہ و دِل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا

ارض و سما کہاں تری وُسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دِل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزُو کریں

خواجہ میر نام، دردؔ تخلص، سنہ $\frac{1720ء}{1133ھ}$ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ان کے دادا بخارا سے عہدِ عالمگیر میں دِلّی آئے۔ اُن کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب بھی صوفی اور شاعر تھے۔ خواجہ میر دردؔ مشہور عالم اور درویش تھے اُن کو تصوف و شاعری ورثے میں ملی تھی۔ والد کے آغوشِ تربیت میں پرورش پائی اور شاعری میں انہی سے اصلاح لی۔ میر دردؔ فنِ موسیقی کے بھی بڑے ماہر تھے۔ اور موسیقی و شاعری کے امتزاج نے اُن کی طبیعت میں زاہدانہ خشکی کے بجائے ایک خاص قسم کی شگفتگی پیدا کر دی تھی۔ استغنا اور دنیا سے بے پروائی کی صفت جو لازمۂ تصوف ہے اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ جب دِلّی پر تباہی آئی اور علم و فضل اور شعر و سخن کا مرکز لکھنؤ میں منتقل ہوا اُس وقت بھی خواجہ صاحب کے پائے استقلال میں لغزش نہ ہوئی۔ اس دَورِ پُر آشوب میں بھی دِلّی کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ سنہ $\frac{1784ء}{1199ھ}$ میں وہیں انتقال کیا۔

خواجہ میر دردؔ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اُردو غزل کی بنیاد خالص عشقِ حقیقی پر رکھی اور یہی اُن کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ اُردو کا کلام پاکیزہ اور متین ہے تصوف کی چاشنی نے کلام میں گہرائی اور گداز پیدا کر دیا ہے۔ اُن کے مختصر دیوان میں اخلاق، تصوف، کیفیاتِ قلبی، وارداتِ حُسن و عشق سبھی کچھ موجود ہے۔ خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو غزلیں کہی ہیں بقول امیر مینائی "پسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں"۔ غزلوں کے علاوہ اُن کی رباعیاں بھی اُردو شاعری میں خاص درجہ رکھتی ہیں۔ اُن میں صوفیانہ، عاشقانہ اور اخلاقی مضامین، مُؤثر انداز میں بیان کئے ہیں کلام نامانوس ترکیبوں، ثقیل الفاظ اور دُوسرے معائب سے پاک ہے۔

میر تقی میر

میر تقی میر

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

مصائب اور تھے، پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

آگے تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب ہوئے خاک انتہا ہے یہ

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی، زنجیر نظر آئی

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

میر اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت سے، اُس آرام طلب کو

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

گرمیِ عشق مانعِ نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال ہوں کہ اُگا اور جل گیا

ہم سے دیوانے رہیں شہر میں سبحان اللہ
دشت میں قیس رہے، کوہ میں فرہاد رہے

دامان و جیب ٹکڑے ہوئے مل کے ایک جا
اب کے یہ کام ہاتھ سے میرے سمٹ گیا

یوں اٹھے آہ اُس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

محمد تقی نام، میر تخلص، پردادا حجاز سے دکن آئے۔ وہاں سے احمد آباد (گجرات) میں آکر قیام کیا۔ آخر اکبر آباد (آگرہ) میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ میر تقی سنہ ۱۷۲۳ء / ۱۱۳۵ھ میں وہیں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد علی تھا۔ علی متقی کے لقب سے مشہور تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد اور سید امان اللہ سے حاصل کی۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے، اس لئے اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس دلّی چلے آئے اور اُنہی کے زیرِ تربیت میں پرورش پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سلطنتِ مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ دلّی میں آئے دن کی خانہ جنگیوں اور بدامنیوں نے میر صاحب کو دل برداشتہ کر دیا تھا۔ نواب آصف الدولہ کی دعوت پر سنہ ۱۷۸۲ء / ۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ چلے گئے۔ کسی بات پر نواب سے اَن بن ہو گئی اور دربار کا تعلق منقطع ہو گیا۔ سنہ ۱۸۱۰ء / ۱۲۲۵ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ اردو شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ "نکات الشعرا" ۱۷۵۲ء / ۱۱۶۵ھ اور "ذکرِ میر" (فارسی) اُنھوں نے لکھا۔ میر اُن سے یادگار ہیں۔

میر کا کلام سوز و گداز اور درد و اثر کا بے مثال مرقع ہے۔ اُن کے بہتّر نشتر اردو شاعری میں کوئی جواب نہیں رکھتے۔ حد یہ ہے کہ مرزا غالب جیسے ہمہ گیر اور جامع الکمالات شاعر سے بھی اُس کی تقلید نہ ہو سکی

میر حسن

(مثنوی)

وہ سنسان جنگل وہ نورِ قمر
وہ براق سا ہر طرف دشت و دَر
وہ اُجلا سا میداں چمکتی سی ریت
اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور
گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

(غزل)

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

نہ تھمتی تھیں آہیں، نہ رُکتے تھے آنسو
حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا

جب قفس میں تھے تو تھی یادِ چمن ہم کو حسن
اب چمن میں ہیں، تو پھر یادِ قفس آتی ہے

رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا
بس اے زندگی ایسی ہستی سے گذرے

تو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں
لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائے گا

میر غلام حسن نام حسن تخلص، ۱۷۲۷ء / ۱۱۴۰ھ میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر غلام حسین ضاحک تھا۔ جدِ امجد میر امامی ایران سے دہلی آئے۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ میر حسن فطری شاعر تھے شروع میں والد سے اصلاح لیتے رہے بعد میں خواجہ میر درد سے استفادہ کیا۔ آغازِ شباب میں والد کے ہمراہ فیض آباد گئے بعد میں لکھنؤ آئے اور ضیاء الدین ضیاء کے شاگرد ہوئے لیکن میر و سودا کا رنگ مرغوب تھا۔ شاعری بزرگوں سے میراث میں پائی تھی۔ زندگی ہی میں بامِ شہرت پر پہنچ گئے اور بقول آزاد "زمانے نے اُن کی سحر البیانی پر تمام تذکرہ نویسوں سے محضرِ شہادت لکھوایا۔" ۱۷۸۶ء / ۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ "شاعرِ شیریں زبان" سے مصحفی نے تاریخِ وفات نکالی۔ ایک دیوان جو جملہ اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔ گیارہ مثنویاں اور فارسی زبان میں تذکرہ شعرائے اردو جو ۱۷۷۴ء / ۱۱۸۸ھ و ۱۷۷۸ء / ۱۱۹۲ھ کے درمیان لکھا "یادگار" ہیں۔

میر حسن کا کلام سادہ، زبان شستہ اور مضامین عاشقانہ ہیں۔ مثنویوں میں "سحر البیان" اور "گلزارِ ارم" قابلِ ذکر ہیں۔ خصوصاً "سحر البیان" کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ اردو زبان کی کسی مثنوی کو نہیں ہوئی اُس کی بدولت اُن کے سر پر بقائے دوام کا تاج رکھا گیا۔ یہ مثنوی ۱۷۸۵ء / ۱۲۰۰ھ میں مکمل ہوئی۔ میر حسن کی خصوصیت منظر نگاری اور جذبات کی ترجمانی ہے۔ مضمون کی شوخی، بیان کی صفائی اور محاورہ کا لطف قابلِ دید ہے۔ زبان ایسی پاکیزہ ہے کہ ڈیڑھ سو سال گذر جانے کے بعد بھی آج کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ صدہا شعر ضرب المثل کے طور پر مستعمل ہیں۔

نظیر اکبر آبادی

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

اس کے شرارِ حسن نے جلوہ جو اک دکھا دیا
طور کو سر سے پاؤں تک پھونک دیا جلا دیا

شہر میں لگتا نہیں ہم سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانہ کو ہم

ولی محمد نام، نظیر تخلص، ۱۷۳۵ء (۱۱۴۸ھ) میں دہلی میں پیدا ہوئے والد کا نام محمد فاروق تھا۔ ۱۷۶۱ء (۱۱۷۵ھ) میں احمد شاہ ابدالی نے جب دلی پر حملہ کیا تو نظیر آگرہ چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے ۱۸۳۰ء (۱۲۴۶ھ) میں آگرہ میں انتقال کیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ نظیر کا کلام کتنا تھا کیونکہ انہوں نے زندگی میں کبھی اپنا کلام جمع نہیں کیا۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی نثر میں بھی نو کتابیں لکھیں۔ نظیر ایک نغز گو، بذلہ سنج اور رمز شناس شاعر تھے۔ شاعری میں کسی کے مقلد یا پیرو نہ تھے بلکہ خود ہی اپنے رنگ کے موجد تھے۔ ان کا موضوع انسان اور اس کی معاشرت ہے۔ انسانی ہمدردی، جزئیات کا مطالعہ اور ہمہ گیر تخیل ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ زبان پر قدرت، معاشرتی حالات پر عبور، فطرت کی رمز شناسی، مناظرِ قدرت کی مصوری، مختلف فنون کا وقوف، سیاسی بصیرت، رفتارِ زمانہ سے دلچسپی، صنعت و حرفت سے واقفیت، اختراعِ الفاظ کا سلیقہ، ظرافت، سوز و گداز، ترنم غرض کہ نظیر میں شاعری کے سارے لوازم و محاسن موجود ہیں۔ ان کا کلام صنائع و بدائع سے مالا مال ہے۔ نظیر نے اردو زبان میں نئی بندشوں اور جدید ترکیبوں کا اضافہ کیا اور قدیم فرسودہ استعارے و تشبیہیں چھوڑ کر جدید شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ اردو شاعری میں نیچرل شاعری کا پیوند سب سے پہلے انھی نے لگایا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ گھریلو واقعہ اور سادہ سے سادہ منظر کو باتوں باتوں میں کھیل کود کی آڑ لے کر ظرافت اور تفننِ طبع کے طور پر جس طرح نظیر نے بیان کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ نظیر نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شاعری داخلی اور خارجی دونوں حیثیتوں سے مکمل ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو، معیشت اور معاشرت کا کوئی انداز، احساسات و تاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں جو کلیاتِ نظیر میں نہ ملتا ہو۔ البتہ جوانی کا کچھ کلام فحش ہے۔ ڈاکٹر فیلن کا قول ہے "نظیر ہی اردو کا اکیلا وہ شاعر ہے جس کی شاعری اہلِ فرنگ کے معیار کے مطابق سچی شاعری ہے۔"

مصحفی

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

حسرت پہ اُس مسافرِ بیکس کے روئیے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

آنے دو اُسے جس کے لئے چاک کیا ہے
ناصح سے گریباں کو سِلانے کے نہیں ہم

کُنجِ قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر
فصلِ بہار، باغ میں دُھومیں مچاگئی

مت میرے رنگِ زرد کا چرچا کرو کہ یاں
رنگ ایک سا ہمیشہ کسی کا نہیں رہا

فصلِ گُل فصلِ خزاں دونوں گئیں اے صیّاد
مُرغِ دل کون سے موسم میں رہا ہووے گا

غم کھاتا ہوں جتنا مری نیت نہیں بھرتی
کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

کوچے سے نکل کر ترے میں نالہ کروں گا
معلوم ہوا، اب مجھے تاثیر نہیں یاں

شیخ غلام ہمدانی نام مصحفی تخلص، سنہ ۱۷۵۰ء (۱۱۶۴ھ) میں بمقام امروہہ ضلع مراد آباد پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ ولی محمد تھا جوانی ہی میں تحصیلِ علم کا شوق دِلّی کھینچ لایا۔ بزرگوں کی صحبتوں سے مستفیض ہوئے۔ دُوسرے شعراء کی طرح یہ بھی دِلّی کو خیرباد کہہ کر نواب آصف الدولہ کے زمانے سنہ ۱۷۸۳ء (۱۱۹۸ھ) میں لکھنؤ گئے۔ مصحفی "تذکرۂ ہندی" میں لکھتے ہیں کہ "سید انشا شہزادہ سلیمان شکوہ (ابنِ شاہ عالم ثانی) کے دربار میں پہلے سے موجود تھے۔ وہی شہزادہ کے حکم سے مجھ کو دربار میں لے گئے" لیکن آخر میں سید انشا مصحفی کے لئے وبالِ جان بن گئے۔ بشتر شاعری میں خوب خوب معرکے رہے۔ اپنے پیش رُوؤں کی طرح دِلّی کی یاد اُنہیں بھی ستاتی رہی۔ سنہ ۱۸۲۴ء (۱۲۴۰ھ) میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ اچھے شاعر کی حیثیت سے مصحفی سنہ ۱۷۷۹ء (۱۱۹۳ھ) میں دِلّی میں مشہور ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۷۹۴ء (۱۲۰۹ھ) سے پہلے فارسی کے دو دیوان ترتیب دے چکے تھے۔ دو تذکرے اُردو گو شعراء کے تذکرۂ ہندی (ریاض الفصحا) اور ایک تذکرہ فارسی گو شعرا کا (عقدِ ثریا) فارسی زبان میں ترتیب دیا۔ چونکہ اُنھوں نے طویل عمر پائی تھی اس لئے بیشتر شعراء کے حالات بڑی حد تک معتبر اور مستند ہیں۔ آٹھ دیوان اُردو کے اور بیں مثنویاں (جو اب تک مل سکی ہیں) یادگار چھوڑیں۔ مصحفی کی اُستادی کا لوہا تقریباً سبھی نے مانا۔ بڑے پُرگو استاد ہونے کے باوجود اُن کے کلام میں صفائی اور روانی پائی جاتی ہے۔ ناہمواری اور فحاشی نہیں ہے۔ بقول آزادؔ "سب رنگ کے شعر ہوتے تھے کسی خاص طرز کی خصوصیت نہیں" اُن کے ہاں تغزّل، معاملہ بندی، تصوف، اخلاق، فلسفہ سبھی کچھ موجود ہے۔

سیّد انشا

اُس سے خلوت کی ٹھہر جاتی تو میں اللہ سے
واسطے دو دن کے عرشِ کبریائی مانگتا

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے لا
جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا

ہوئے ہیں خاکِ سرِ راہ، اُس کی ہم انشا
بڑا غضب ہے، جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

گر یار مے پلائے، تو پھر کیوں نہ پیجیے
زاہد نہیں، میں شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

سیّد انشاء اللہ خاں نام انشا تخلص، ۱۷۵۶ء/۱۱۷۰ھ اور ۱۷۵۸ء/۱۱۷۲ھ کے درمیان مرشد آباد میں پیدا ہوئے بزرگ نجفِ اشرف سے آکر دلّی میں بس گئے تھے۔ انشا کے والد میر ماشاء اللہ خاں بڑے عالم و فاضل اور حاذق طبیب تھے۔ باپ کے دامن تربیت میں پرورش پاکر انشا بھی عالم، فاضل طبیب اور شاعر ہوئے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ ابتدا میں والد سے اصلاح لی۔ عربی، فارسی، اُردو اور ہندی زبانوں میں نظم کی یکساں قدرت رکھتے تھے ہندوستان کی متعدد زبانوں پر عبور تھا۔ مرشد آباد سے دلّی آئے اور شاہ عالم ثانی کے درباریوں میں جگہ پائی۔ شعراء کی چشمک اور حالات کی ناسازگاری سے بددل ہو کر ۱۷۹۱ء/۱۲۰۶ھ میں لکھنؤ چلے گئے۔ مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رہے پھر نواب سعادت علی خاں کے دربار میں رسائی حاصل کی اور ظرافت، بذلہ سنجی، اور شوخ مزاجی سے نواب کو اپنا اس قدر گرویدہ بنا لیا کہ اُن کے بغیر اُسے ایک دم چین نہ آتا تھا۔ آخر میں نواب سے کسی بات پر اَن بَن ہو گئی اور عمر کا آخری زمانہ گوشہ نشینی اور کس مپرسی کی حالت میں گذار کر بمقام لکھنؤ ۱۸۱۷ء/۱۲۳۳ھ میں وفات پائی۔

فطری ظرافت اور درباری زندگی نے ہزل اور تمسخر کو انشا کی شاعری کا جزو لازم بنا دیا تھا۔ اُن کو زبان پر جو حیرت انگیز قدرت حاصل تھی اگر وہ صحیح طور پر استعمال ہوتی تو اُن کا جواب اُردو شاعری میں مشکل سے ملتا۔ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے قصیدے نہایت متین اور سنجیدہ انداز میں کہے ہیں۔ ریختی یعنی عورتوں کے جذبات و خیالات عورتوں کی زبان میں بڑی خوبی سے ادا کرتے ہیں "سچ میں تجھے صدقے نہ رکھ میری پیاری زُرزہ۔ بندی کو لگی تیرے بھلے ہزاروی زُرزہ"۔ شاعری کے علاوہ انشا کی دو تصنیفیں یادگارِ زمانہ ہیں۔ "دریائے لطافت" جو اُردو قواعد کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ "رانی کیتکی" ۱۸۰۳ کی داستان جس میں یہ کمال ہے کہ عربی یا فارسی کا ایک لفظ بھی آنے نہیں پایا۔

خواجہ آتش

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

حسنِ پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا

خواجہ حیدر علی نام، آتش تخلص، دلی کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد خواجہ علی بخش نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۷۷۸ء / ۱۱۹۲ھ میں آتش پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اس لئے معقول تعلیم سے محروم رہے۔ جوانی کی ترنگ، مزاج میں شوریدہ سری اور انداز میں بانکپن ساتھ لائی۔ ضعیفی تک بانکپن اور سپاہیانہ وضع کو بڑی خوبی سے نباہا۔ انشا اور مصحفی کے معرکوں نے شعر و شاعری کا شوق دلایا۔ مصحفی کے شاگرد ہوئے اور صاحب طرز استاد کہلائے۔ ساری عمر خودداری اور فقیرانہ انداز سے گذار دی۔ ۱۸۴۶ء / ۱۲۶۳ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ شعر گوئی میں ناسخ سے خوب خوب معرکے رہے۔

خواجہ آتش اور شیخ ناسخ چونکہ صاحب طرز ہیں اس لئے لکھنؤ میں دونوں کے اسکول قائم ہو گئے۔ یہ صحیح ہے کہ آتش اور ناسخ کے کلام میں اکثر خصوصیات مشترک ہیں لیکن چند خصوصیات ایسی ہیں جن کی وجہ سے آتش کا کلام ناسخ کے مقابلہ میں زیادہ دلآویز اور موثر ہے۔ بقول غالب "ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے ہاں بیشتر تیز نشتر ہیں"۔ آتش کی زبان صاف اور شستہ ہے۔ مضامین میں شوخی، رنگینی اور رعنائی ہے۔ بندش چست اور الفاظ دلکش ہیں۔ تشبیہات میں لطافت آمیز سادگی پائی جاتی ہے۔ منتخب محاورات کا برمحل استعمال سونے پر سہاگے کا کام دیتا ہے۔ آتش کی شاعری اگر ایک طرف تغزل و محبت کی آئینہ دار ہے، تو دوسری طرف اس میں فقیری کی شان بھی جھلکتی ہے۔

ناسخ

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

بتوں کے پردہ میں ہم دیکھتے ہیں نورِ خدا
خدا کے دیکھنے کی اے کلیم تاب نہیں

محشر میں ہم کو نامۂ اعمال دیکھ کر
قاصد خیال آئے گا خط کے جواب کا

عمر بھر وحشت میں گر صحرا نوردی کی تو کیا
سیر کے قابل جو تھا دِل کا بیاباں، رہ گیا

تاب سننے کی نہیں، بہرِ خدا خاموش ہو
ٹکڑے ہوتا ہے جگر، ناسخ تری فریاد سے

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا

تمام عمر یونہی ہو گئی بسر اپنی
شبِ فراق گئی، روزِ انتظار آیا

امام بخش نام، ناسخ تخلص، ۱۷۸۷ء/۱۲۰۲ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندانی حالات تاریکی میں ہیں۔ کہتے ہیں کسی دولت مند سوداگر نے انہیں متبنیٰ کر لیا تھا۔ اسی نے تعلیم و تربیت کی۔ فارسی اور عربی کی تعلیم علمائے فرنگی محل سے پائی اور لکھنؤ کو وطن بنا لیا۔ شاعری میں کسی سے تلمذ نہ تھا۔ ۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ رشک نے تاریخ کہی "ولا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے"۔ شاگردوں کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ تین دیوان ان کی یادگار ہیں۔ پہلا دیوان الٰہ آباد میں، دوسرا اور تیسرا لکھنؤ میں مرتب کئے۔

ناسخ اسم با مسمیٰ ہیں۔ انھوں نے قدما کا سادہ طرزِ کلام بدلا ہے۔ فحاشی اور ہجو سے زبان کو پاک کیا ہے۔ الفاظ فارسی و عربی استعمال کئے ہیں۔ سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ کو چھوڑ دیا ہے۔ عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کی تذکیر و تانیث کے قواعد مقرر کئے ہیں۔ بندش کا طرز فارسی کے طرز پر قائم کیا ہے جس سے مضامین میں وسعت پیدا ہوئی اور شعر کے ظاہری حسن میں اضافہ ہو گیا۔ مضامین میں عاشقانہ طرز کو کم کر کے ہر قسم کے مضامین غزل میں شامل کئے ہیں۔ زبان کی اصلاح کی ہے۔ خیال بندی کو رائج کرنے اور غزل کی سلیس زبان کو چھوڑ دینے کے باعث، وارداتِ قلبیہ سے ان کی غزلیں خالی ہو گئی ہیں اور ان میں بہت سے ایسے مضامین داخل ہو گئے ہیں جو احاطۂ غزل سرائی سے باہر تھے۔ باایں ہمہ ان کے کلام میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں صفائی، شستگی اور کیف و اثر پایا جاتا ہے۔

ابراہیم ذوق

سر تا قدم ہیں شوق تری طالبِ جمال
مشتاق روزہ دار ہیں گویا ہلال کے

(قصیدہ)

واہ وا! کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا
مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار
بن گیا گلزارِ عالم رشکِ صد دار الشفا

سریر آرائے گردوں جب تلک سلطانِ خاور ہو
قمر دستورِ اعظم، صدرِ اعلیٰ سعدِ اکبر ہو

عطارد میرِ منشی، زہرہ ناظر آسماں پر ہو
زحل میرِ عمارت، تیرِ گردوں میرِ لشکر ہو

بہ ہفت آسماں جب تک کہ دورِ ہفت اختر ہو
الٰہی یہ بہادر شاہ، شاہِ ہفت کشور ہو

(غزل)

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے
کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوئے پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا انہیں کیا اضطراب میں

سب کو دیکھا اُس نے اور اُس کو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں، اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

محمد ابراہیم نام، ذوق تخلص۔ ۱۷۸۹ء / ۱۲۰۴ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا۔ جو ایک غریب سپاہی تھے ابتدائی تعلیم اگرچہ معمولی ہوئی تھی مگر کثرتِ مطالعہ نے اُن کی فطری صلاحیتوں کو اُبھار دیا۔ شروع میں حافظ غلام رسول شوق سے اصلاح لی بعد میں شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے۔ تمام عمر دلّی میں رہے اور وہیں ۱۸۵۴ء / ۱۲۷۱ھ میں انتقال کیا۔ اکبر شاہ ثانی نے "خاقانیِ ہند" کا خطاب عطا کیا۔ بہادر شاہ ظفر شہزادگی کے زمانے ہی سے ذوق سے مشورہ سخن کرتے تھے۔

ذوق کا پایہ قصیدہ گوئی میں بہت بلند ہے۔ اُردو ادب میں قصیدہ میرزا سودا سے شروع ہوا اور ذوق پر ختم ہو گیا۔ اس صنفِ سخن کو اُنھوں نے جس عروج پر پہنچایا اُس سے آگے لے جانا اب بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ علمی اصطلاحات سے اُن کے قصائد بھرے پڑے ہیں جن سے اُن کے تبحرِ علمی اور بالغ نظری کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کی غزلیں بھی سادگی اور صفائی کے اعتبار سے اُردو ادب میں بلند مقام رکھتی ہیں۔ پُرگو شعراء کے کلام میں رطب و یابس بہت ہوتا ہے جو اُن کے ہاں کم ہے اور تمام اصنافِ سخن پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ کلام تصنع اور تکلف سے پاک ہے، محاورات و امثال کا استعمال برمحل کرتے ہیں۔

مرزا غالبؔ

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے　　آلودہ بہ مے، جامۂ احرام بہت ہے

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنھ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا　　فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

خزاں کیا، فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو　　وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　ساغرِ جم سے مرا، جامِ سفال اچھا ہے

مَیں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں　　گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے، ازل سے　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات　　دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

چاک مت کر جیب، بے ایامِ گُل　　کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم　　گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا　　مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق　　نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اسد اللہ خاں نام، غالبؔ تخلص، مرزا نوشہ لقب، نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ خطاب۔ ۱۷۹۶ء / ۱۲۱۱ھ میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبداللہ بیگ خاں تھا۔ سلسلۂ نسب تور بن فریدوں شاہ ایران تک پہنچتا ہے۔ ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور اساتذہ سے پائی۔ مرزا صاحب کی زندگی دہلی میں گزری۔ اُستاد ذوقؔ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ نے اُنہی کو اپنا کلام دکھایا۔ ۱۸۶۹ء / ۱۲۸۶ھ میں دہلی میں وفات پائی۔

شعر و سخن کی تاریخ میں مرزا غالبؔ جیسے نکتہ سنج، نغز گفتار، کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ اُن کو فارسی نثر و نظم میں ایسا کمال تھا کہ قدما کی پختگی معلوم ہوتی ہے اور تقلیدِ کامل میں اجتہاد کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اردو رقعات اپنی جدت، دلفریبی اور طرزِ ادا کے لئے مشہور ہیں۔ اردو شاعری میں کیا غزل کیا قصیدہ، کیا مثنوی، ہر صنف جدت اور اجتہاد، تازگی اور شگفتگی کا مرقع ہے۔ خیال کی لطافت اور بلندی، روزمرہ اور محاورات کا لطف، طرزِ ادا کی شوخی، اجزائے کلام کی ترتیب، سلاست اور روانی، ترنم اور موسیقی نے اُن کے کلام کو سہلِ ممتنع بنا دیا ہے۔ اُن کا مختصر مگر دلکش کلام آرٹ اور فلسفہ کا ایسا حسین امتزاج ہے کہ بلا تکلف بین الاقوامی ادب میں جگہ پا سکتا ہے۔

مومنؔ

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تا نہ کہیں خلل پڑے آپ کے خوابِ ناز میں
ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر، جو حیراں ہوں گے

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل، کیسا نکل آیا
میں الزام اُس کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا

اُس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے، اثر کو دعا کے ساتھ

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھکو اپنی نظر نہ ہو جائے

تو کہاں جائے گی، کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل، خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

مومن خاں نام، مومن تخلص، سنہ ۱۸۰۰ء/۱۲۱۵ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حکیم غلام نبی تھا۔ دادا حکیم نامدار خاں شاہ عالم کے عہد میں کشمیر سے دلی آئے اور شاہی طبیبوں میں شامل ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے مومن نام رکھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اُس کے بعد شاہ عبدالقادر دہلوی سے تعلیم حاصل کی۔ شاہ ولی اللہؒ کا خاندان مدتوں دلی میں اپنے علم و فضل کے لیے مشہور رہا ہے۔ اور اس لحاظ سے مومن بڑے خوش نصیب تھے کہ انہیں ایسے گھرانے میں تحصیلِ علم کا موقع ملا۔ والد اور چچا سے فنِ طب کی تکمیل کی۔ نجوم میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لی۔ مومن کو طبابت ورثہ میں ملی۔ بے چین طبیعت نے اختر شناسی سے روشناس کیا۔ مزاج کی رنگین اُفتاد نے عاشق مزاج بنایا اور حسن و عشق کی گود میں پلی ہوئی زندگی نے اُن کی شاعری کو رنگین تغزل سے سرفراز کیا۔ تصنیفات میں کلیاتِ اُردو، دیوانِ فارسی، انشائے فارسی اُن سے یادگار ہیں۔ ۱۸۵۱ء/۱۲۶۸ھ میں دہلی میں انتقال کیا۔

مومن کا شمار اُردو کے اچھے غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ واقعاتِ حسن و عشق کو دل فریب بندشوں اور نرالی ترکیبوں سے ادا کرتے ہیں۔ اُن کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کا آئینہ دار ہے۔ اکثر مواقع پر مضمون کے اجزاء چھوڑ جاتے ہیں (اور یہ کام مخاطب کے سپرد کرتے ہیں کہ اُن کو پورا کرے) جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ طرزِ بیان میں سلاست اور کہیں کہیں جدت بھی ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کے ساتھ ساتھ فارسی ترکیبیں بھی استعمال کرتے ہیں

میر انیس

میر انیس

طاقت دکھاؤں میں جو رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا
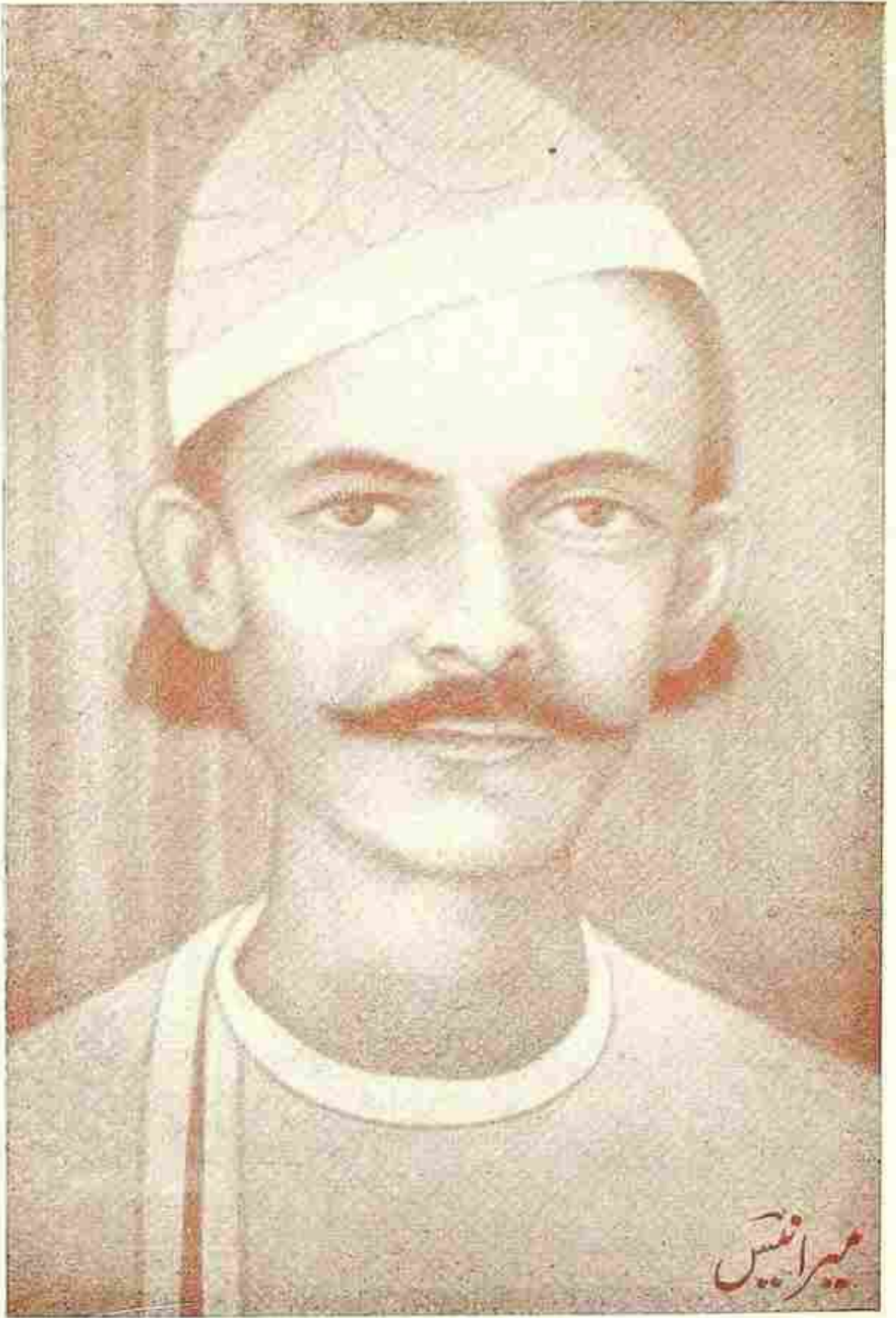
طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

کانپے طبق زمیں کے، ہلا چرخِ لاجورد
مانندِ کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد

پرتو فگن تھا نور، رسالت مآب کا
سر پر لگا تھا، چترِ زری آفتاب کا

کیا جانے کس نے روک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے، یہ غصہ ہے شیر کو

یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

لرزہ تھا رعبِ حق سے ہر اک نابکار کو
روکے تھا ایک شیرِ جری دس ہزار کو

تھا صمصمہ بھی اشدِ کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم، کچھار سے

دوزخ کی زبانوں سے بھی آنچ اُس کی بری تھی
برچھی تھی، کٹاری تھی، سروہی تھی، چھری تھی

چم خم کا جدا رنگ تھا، کس بل کا جدا رنگ
لب سُرخ، دہن صاف، بدن گول، ہرا رنگ

مرحب تھا کفر و شرک میں، طاقت میں گیو تھا
گھوڑے پہ تھا شقی، کہ پہاڑی پہ دیو تھا

خواہاں تھے زیبِ گلشنِ زہرا، جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

چنگاریاں اڑیں، جو سناں سے لڑی سناں
دو اژدہے گتھے تھے، نکالے ہوئے زباں

دکھلائے طور، بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

میر ببر علی نام، انیس تخلص ۱۸۰۱ء / ۱۲۱۶ھ میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ میر مستحسن خلیق کے بیٹے میر حسن دہلوی صاحب مثنوی سحرالبیان کے پوتے تھے۔ جدِ امجد میر امامی ایران سے دلی آئے۔ لیکن زمانہ کی نامساعدت نے میر حسن کو ترکِ وطن پر مجبور کیا۔ پہلے فیض آباد گئے پھر لکھنؤ آکر بود و باش اختیار کی۔ میر انیس کی تعلیم و تربیت لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں والد کے ارشاد پر مرثیہ گوئی کی طرف توجہ فرمائی اور اس میں چار چاند لگا دیے۔ میر انیس نے ۱۸۷۴ء / ۱۲۹۱ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ مرثیہ گوئی ورثہ میں ملی تھی۔ خود فرماتے ہیں ؎

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

میر انیس نے مداحِ آلِ رسول کی حیثیت سے اردو شاعری میں وہ نام آوری حاصل کی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ انھوں نے اردو زبان میں منظر نگاری کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ فارسی تراکیب کی دل نشینی، زبان کی صفائی، بیان کی سادگی اور خیالات کی نفاست و نزاکت اُن کی شاعری کے نمایاں اجزا ہیں۔ وہ اپنے کلام میں تازہ تشبیہات و استعارات بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے دنیا کے مشہور شعراء کی صف میں اپنا مقام تلاش کیا ہے۔

میرزا دبیر

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی
پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطعِ زلفِ لیلیِ زہرہ لقب ہوئی
مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکرِ رفو تھی، چرخِ ہنرمند کے لئے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لئے

یوسف غریقِ چاہِ سیہ، ناگہاں ہوا
یعنی غروب، ماہِ تجلی نشاں ہوا
یونس دہانِ ماہیِ شب سے عیاں ہوا
یعنی طلوع، نیرِ مشرق ستاں ہوا

فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم، اور یدِ بیضا تھا آفتاب

تھی صبح یا کہ چرخ کا جیبِ دریدہ تھا
یا چہرۂ مسیح کا رنگِ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ چرخ کا اشکِ چکیدہ تھا
یا فاطمہ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا
کہئے: مہرِ صبح کے سینہ پہ داغ تھا
امیدِ اہلِ بیت کا گھر بے چراغ تھا

میرزا سلامت علی نام، دبیر تخلص، والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ ملا ہاشم شیرازی شاعر تھے جو شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں دہلی آئے۔ دبیر (۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ) میں وہیں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ چلے گئے اور فارسی و عربی کی کتابیں وہاں کے نامور علماء سے پڑھیں۔ علمی استعداد فاضلانہ رکھتے تھے۔ شعر و شاعری سے قدرتی مناسبت تھی۔ مرثیہ میں مظفر حسین ضمیر لکھنوی کے شاگرد ہوئے، انہی نے دبیر تخلص رکھا۔

میرزا دبیر نے پندرہ سال کی عمر سے مرثیہ گوئی شروع کی جو کچھ استاد سے پایا اسے بقول آزاد "بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا"۔ بیان کرنے کے نئے اسلوب اردو شاعری میں بکثرت پیدا کئے۔ ایک ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوتِ متخیلہ کی جولانیوں کیلئے نیا میدان صاف کر دیا۔ وہ ساری عمر لکھنؤ میں رہے۔ آخری عمر میں آنکھوں کے علاج کیلئے واجد علی شاہ کے ایما پر کلکتہ گئے اور مرشد آباد، عظیم آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ واپس آئے اور وہیں (۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ) میں وفات پائی۔

مرثیہ گوئی میں انیس اور دبیر کے طرز جدا جدا ہیں۔ دبیر کے ہاں دور خیز کنایات، تشبیہات و استعارات، شاعرانہ استدلال، شوکتِ الفاظ، خیال آفرینی، دقت پسندی، مضمون بندی پر زیادہ زور ہے۔ اس کے ساتھ مناظر کی تصویر کشی، جذبات نگاری، الفاظ کی سلاست اور فصاحت و بلاغت کی بھی کمی نہیں ہے۔

دیا شنکر نسیم

(مثنوی)

(گُل بکاؤلی) جاگی مُرغِ سحر کے غُل سے

اُٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے

مُنھ دھونے جو آنکھ ملتی آئی

پُر آب وہ چشمِ حوض پائی

دیکھا تو وہ گُل ہَوا ہُوا ہے

کچھ اور ہی گُل کِھلا ہُوا ہے

کرتی تھی، بھوک پیاس بس ہیں

آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں

جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ

کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

صُورت بیں خیال رہ گئی وہ — ہیئت میں مثال رہ گئی وہ

(غزل) لائے اُس بُت کو التجا کر کے — کُفر ٹوٹا خُدا خُدا کر کے

ساقی قدحِ شراب دے دے — مہتاب میں آفتاب دے دے

عشق کے رُتبے کے آگے آسماں بھی پست ہے — سر جھکایا ہے فرشتوں نے بشر کے سامنے

بہارِ رفتہ پھری اب ترے تماشے کو — چمن کو یُمنِ قدم نے ترے نہال کیا

پنڈت دیا شنکر نام نسیم تخلص سنہ ۱۸۱۱ء (۱۲۲۶ھ) میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول۔ نسیم ایک معزز کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اُردو اور فارسی کی اچھی تعلیم پائی تھی۔ بعہدِ امجد علی شاہ فوج کی تنخواہ تقسیم کرنے پر مامور تھے۔ شعر و سخن کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ آتش کے شاگرد ہوئے۔ لکھنؤ میں میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کا اُس زمانے میں بڑا چرچا تھا۔ نسیم کو یہ طرز کچھ ایسا پسند آیا کہ سنہ ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ) میں (میر حسن کی تصنیف کے نصف صدی بعد) گُل بکاؤلی کے مقبولِ عام قصہ کو نظم کا جامہ پہنایا۔ اور "مثنوی گلزارِ نسیم" نام رکھا۔ عالمِ شباب میں بمقام لکھنؤ سنہ ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) میں انتقال کیا۔ اردو زبان میں اَن گنت مثنویاں لکھی گئیں۔ لیکن جو شہرت اور قبولِ عام مثنوی "سحر البیان" اور "گلزارِ نسیم" کو حاصل ہے وہ کسی کو نصیب نہیں۔ مثنوی گلزارِ نسیم ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس میں واقعہ نگاری، جذبات نگاری، ایجاز و اختصار، رمز و اشارہ، تشبیہ و تمثیل، صنائع و بدائع غرض تمام شاعرانہ خوبیاں موجود ہیں۔ بیان کے اعتبار سے نظم اتنی مربوط ہے کہ اگر ایک شعر بیچ میں سے نکال لیجئے تو ساری داستان درہم برہم ہو جاتی ہے۔ غزل میں بھی نسیم کا رنگ عاشقانہ اور سادہ ہے۔

امیر مینائیؒ

بارک اللہ کھل گئی قسمت مسلماں ہو گئے
خاتم اسلام ہاتھ آئی سلیماں ہو گئے
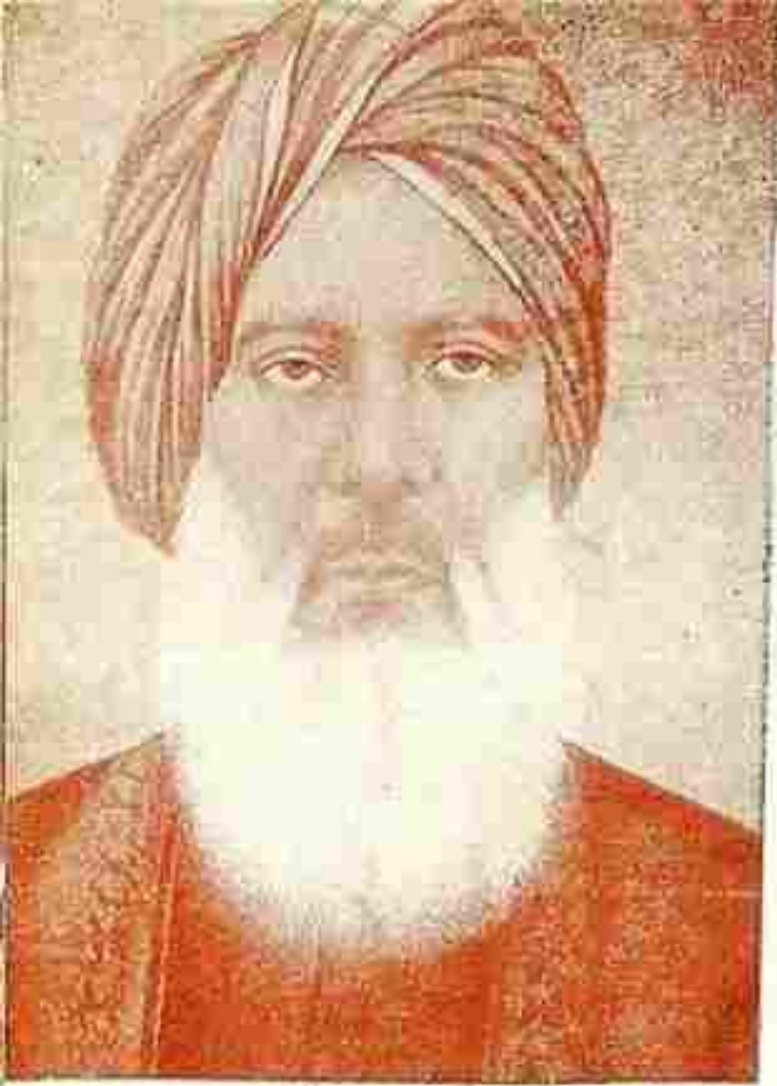
پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش
مدت ہوئی غریب، وطن سے نکل گیا

ہر رنگ، جوشِ محبت کا نیا عالم ہوا
آنکھ میں آنسو، جگر میں داغ، دل میں غم ہوا

مرغانِ باغ! تم کو مبارک ہو سیرِ گل
کانٹا تھا ایک میں، سو چمن سے نکل گیا

دیر کی تحقیر کر اتنی نہ اے شیخِ حرم
آج کعبہ بن گیا، کل تک یہی بت خانہ تھا

دیکھ اے درد، جدا ہو نہ دلِ محزوں سے
اور اُلجھے گا یہ بیمار، جو تنہا ہو گا

نہ کرے یاس، یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے، چراغ آرزو برسوں

دنیا ہے، طرفہ میکدۂ بے خودی امیر
سب مست ہیں، کسی کو کسی کی خبر نہیں

زاہد، امیدِ رحمتِ حق اور ہجوِ مے
پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

خنجر چلے کسی پہ، تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد، ہمارے جگر میں ہے

منشی امیر احمد مینائی نام، امیر تخلص، لکھنؤ وطن، مخدوم شاہ مینا کے خاندان سے ہیں۔ مولوی کرم احمد کے صاحبزادے سنہ ۱۸۲۸ء / ۱۲۴۴ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مولانا مفتی محمد سعد اللہ وغیرہ سے تعلیم حاصل کی اور شاعری میں اسیر لکھنوی سے اصلاح لی جو مصحفی کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں واجد علی شاہ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ ارشاد السلطان اور ہدایۃ السلطان کتابیں اُن کے دربار میں پیش کیں، اس پر خلعتِ فاخرہ عطا ہوا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد رام پور گئے۔ نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں نے قدر دانی کی اور اپنا کلام دکھایا۔ اُس وقت رام پور میں اہلِ کمال کا جمگھٹ تھا۔ نواب کے انتقال کے بعد سب سے پہلے مرزا داغ حیدر آباد دکن گئے۔ پھر امیر مینائی بھی پہنچے لیکن چند روز کے بعد سنہ ۱۹۰۰ء / ۱۳۱۸ھ میں وہیں وفات پائی۔ مراۃ الغیب اور صنم خانۂ عشق کلام کے مجموعے ہیں۔ امیر اللغات کی صرف دو جلدیں شائع ہوئیں۔ اگر یہ لغت مکمل ہو جاتی تو اُردو زبان کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہو جاتا۔ امیر و داغ دورِ آخر میں آسمانِ شاعری کے مہر و ماہ تھے۔ امیر کا رجحان مضمون آفرینی کی طرف تھا۔ وہ نازک خیالی کے ساتھ ساتھ شکوہِ الفاظ سے بھی دست بردار نہیں ہوتے تھے۔ اگرچہ وقت پسندی کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اُن میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ جیسے جیسے بوڑھے ہوتے گئے کلام میں جوانی کی امنگیں اُبھرتی گئیں۔

فصیح الملک داغ

اُمیدِ کرم ہو کر ہم مے سے کریں توبہ
دوزخ میں پڑے زاہد اب لطف تو ہم اب لیا

خدا کریم ہے یوں تو مگر ہے اتنا فلک
کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا

عمر کیوں کر نہ بسر کیجیے غافل ہو کر
کہ ملا ہے ہمیں اک قطرۂ مے دل ہو کر

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

رہرو راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

تیرے جلوہ کا تو کیا کہنا مگر
دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

سو حسن اُبلتے ہیں، سو ناز برستے ہیں
اے صلِ علیٰ تجھ میں کیا شان نکلتی ہے!

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

نواب مرزا خاں نام، داغ تخلص، فصیح الملک، بلبل ہندوستان، جہان استاد وغیرہ خطابات۔ نواب شمس الدین خاں (خاندانِ لوہارو) کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۳۱ء/۱۲۴۷ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ اُن کی والدہ نے شاہزادہ فتح الملک عرف مرزا فخرو ولیعہد بہادر شاہ ظفر سے نکاح کر لیا۔ اور "شوکت محل" کا خطاب پایا۔ اسی بنا پر داغ کی تعلیم و تربیت لال قلعہ میں ہوئی۔ شعر و سخن میں ذوق کے شاگرد ہوئے، کیونکہ بہادر شاہ ظفر اور مرزا فخرو دونوں انہی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا تو داغ کو بھی لال قلعہ چھوڑنا پڑا۔ یہ مصیبت کیا کم تھی کہ ۱۸۵۷ء میں غدر ہو گیا۔ اس ہنگامے کے بعد رام پور آئے۔ نواب کلب علی خاں نے بڑی قدر کی۔ اُن کے انتقال کے بعد حیدرآباد دکن گئے۔ اور خسرو دکن میر محبوب علی خاں نے شعر و سخن سے اعزاز بڑھایا۔ ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ میں بلبل ہندوستان کی شیوا بیانی ختم ہو گئی۔ داغ اپنے رنگ کے موجد، خوش طبع اور رنگین مزاج تھے۔ اُن کی شاعری میں یہ تمام خصوصیتیں نمایاں ہیں۔ زبان میں فصاحت، ادا میں سادگی اور بیان میں شوخی اور بانکپن موجود ہے۔ پورے کلام میں محاورے کا دریا موجیں مار رہا ہے۔

خواجہ حالی

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

رہا ہوں رند بھی اے شیخ، پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہیں رند و پارسا اِک ایک

تعزیرِ جرمِ عشق ہے ، بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

ہے کچھ اک باقی خلش امید کی
یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیے

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

(مسدس حالی)

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی ۔ عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی ۔ اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے ۔ کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

خواجہ الطاف حسین نام، حالی تخلص ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاری سے ملتا ہے۔ آبا و اجداد شاہ بلبن کے عہد میں ہرات سے آ کر پانی پت میں مقیم ہوئے۔ خواجہ حالی بچپن ہی میں والدین کے سایہ سے محروم ہو گئے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے دہلی چلے گئے اور شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی مصاحبت میں رہنے کا موقع ملا اور اُن کے فیضِ صحبت میں حالی کی شاعری چمکی۔ نواب شیفتہ کے انتقال کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت کی۔ یہاں اُن کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت درست کرنی پڑتی تھی اس سے اُن کو انگریزی خیالات اور انگریزی طرزِ ادا سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی۔ لاہور سے اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس ہو کر چلے گئے اور وہیں ۱۸۷۹ء میں مسدس لکھا۔ ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا اور ۱۹۱۴ء (۱۳۳۳ھ) میں پانی پت میں وفات پائی۔

مولانا حالی عصرِ اصلاح کے علمبردار اور تحریکِ جدید کے حامیوں میں ایک سرگرم رُکن ہیں۔ وہ اُن مشہور لوگوں میں تھے جنہوں نے پرانے مدرسے میں تعلیم پا کر ایسے کارنامے نمایاں کیے جن کی مثال تعلیمِ جدید اب تک پیدا نہیں کر سکی۔ اُن کا مسدس جو سرسید کی تحریک سے لکھا گیا تھا ہر شخص کی زبان پر ہے۔ اردو دیوان کا مبسوط مقدمہ دیکھنے کے قابل ہے، یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے۔ وہ اردو میں سیرت نگاری، تنقید، قومی شاعری اور نیچرل شاعری کے موجد ہیں

اکبر الٰہ آبادی

ہزاروں گُلوں پر فلک کو ترجیح ہر اک جناب تنے ہوئے ہیں

یہی سبب ہے جناب اکبر جو مفلس یا دل بے نوا ہیں

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہوتا ہے انبساط غذائے لطیف سے
غنچے کو دیکھیے کہ ہوا کھا کے کھل گیا

اِک عکس ناتمام پہ، عالم کو وجد ہے
کیا پوچھنا ہے آپ کے حُسن و جمال کا

پُرانی روشنی میں اور نئی میں فرق ہے اتنا
اُسے کشتی نہیں ملتی، اِسے ساحل نہیں ملتا

بہت مشکل ہے بچنا، بادۂ گلگوں سے خلوت میں
بہت آساں ہے یاروں میں، معاذ اللہ کہہ دینا

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے، اور سرا ملتا نہیں

رزولیوشن کی شورش ہے مگر اُس کا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

سید اکبر حسین نام، اکبر تخلص، لسان العصر لقب، خان بہادر خطاب۔ ولادت ۱۸۴۶ء/۱۲۶۲ھ وطن الٰہ آباد والد کا نام سید تفضل حسین رضوی تھا۔ مورثِ اعلیٰ سید علی عرب نیشاپور (ایران) سے ۱۲۳۲ء/۶۳۲ھ میں ہندوستان آئے تھے۔ اکبر کی ابتدائی تعلیم اُن کے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ اِس لیے فلسفہ اور تصوف کا غلبہ ہوگیا۔ انگریزی کی استعداد انھوں نے خود پیدا کر لی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اس کے بعد نائب تحصیلدار ہوگئے۔ ۱۸۸۱ء میں منصف ہوگئے پھر ۱۸۸۸ء میں سب ججی پر ترقی دی گئی۔ ۱۸۹۴ء میں سیشن جج ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں پنشن لی اور ۱۹۲۱ء/۱۳۴۰ھ میں الٰہ آباد میں انتقال کیا۔ لسان العصر سید اکبر حسین بذلہ سنج اور ظریف تھے۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ مولوی وحید الدین وحید شاگردِ مصحفی سے تلمذ تھا۔ اکبر اردو شاعری میں ایک نئی طرز کے موجد تھے وہ اِس رنگ کے بانی بھی تھے اور خاتم بھی۔ ادب اور سوسائٹی کے نقاد اور حکومت و سیاست کے نکتہ چیں تھے اُن کی شاعری اُن تمام ادبی اور معاشرتی رجحانات کی حامل ہے جو ہندوستان میں مغرب کے اولین اثرات کے ردِ عمل سے پیدا ہوئے۔ اگر ایک طرف وہ حالی اور شبلی کی طرح حال کے شاعر تھے تو دوسری طرف وہ اقبال کی طرح استقبال کے شاعر بھی تھے۔ اکبر کی شاعری کا مطالعہ ہماری سوسائٹی کی ذہنیت کا ایسا زندہ مرقع پیش کرتا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اُن کی شاعری محض گل و بلبل ہی کی شاعری نہ تھی۔ بلکہ اس کا ایک نصب العین تھا وہ طنز اور ظرافت کے بادشاہ تھے ہم اُن کی شاعری کے اندر ایک وسیع کائنات پاتے ہیں۔

شاد عظیم آبادی

اب اپنی عمر شیشۂ نازک کا جام ہے
بس اک ذرا سی ٹھیس میں قصہ تمام ہے

شاد ایسے میں نہ توڑا تھا بھلے کو میں نے
پھول پر ہاتھ بڑھایا تھا کہ دل یاد آیا

چشمِ بینا میں کہاں کھپتی ہے دو دن کی بہار
گل جو کھلتے ہیں تو ہنس دیتا ہے شیدا اُس کا

دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جمال
لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

میں اور سیر لالہ و گل ہجر یار میں
کیسی بہار آگ لگا دو بہار میں

تکیہ وعدے پہ ہے سب چپکے پڑے ہیں نہ خاک
حشر کا دن جو نہ آیا، تو قیامت ہوگی

ہزاروں شک ترے دیدار میں بتائے گئے
کہیں کا میں نہ رہا تھا، اگر یقیں ہوتا

یہ بزم مے ہے۔ یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں، مینا اُسی کا ہے

نالوں کی کشاکش سہہ نہ سکا خود تارِ نفس بھی ٹوٹ گیا
اک عمر سے تھی تکلیف جسے کل شب کو وہ قیدی چھوٹ گیا

جب کسی نے حال پوچھا، رو دیا
چشمِ تر، تو نے تو مجھ کو کھو دیا

سید علی محمد نام، شاد تخلص ۱۸۴۶ء/۱۲۶۳ھ میں عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد ان کے بزرگ دہلی سے پٹنہ چلے گئے تھے۔ والد کا نام سید عباس مرزا تھا۔ ادبی تربیت میر سید محمد کے ذمہ تھی جو اُردو زبان کے محقق تھے۔ انہی کی تربیت کا اثر تھا جس نے آئندہ چل کر شاد کی زبان کو اس قدر فصیح و بلیغ کر دیا۔ شاد کی شاعری کا دور پندرہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے۔ کلام کی اصلاح شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی نے کی جو اشکی کے شاگرد تھے اور اُن کو خواجہ میر درد دہلوی سے تلمذ تھا۔ شاد نے اپنی تمام عمر اُردو ادب کی خدمت میں گذاری۔ خان بہادر کا خطاب ملا ایک ہزار دو سو سالانہ وظیفہ گورنمنٹ سے ملتا رہا۔ ۴۲ سال تک آنریری مجسٹریٹ رہے۔ ۱۹۲۷ء/۱۳۴۶ھ میں پٹنہ میں انتقال کیا۔

شاد کے کلام میں اخلاق، فلسفہ اور توحید کا عنصر غالب ہے۔ چونکہ بہت سے کہنہ مشق استادوں کی صحبت اٹھائی تھی کلام میں پختگی پیدا ہو گئی ہے۔ میر انیس اور مونس کی صحبتوں میں رہ چکے تھے اس لئے مرثیے میں زبان و خیال کے اعتبار سے میر انیس کی پیروی کرتے ہیں۔ شاد کا کلام صاف ستھرا ہے۔ مضمون آفرینی کم ہے۔ باتوں ہی باتوں میں مضمون پیدا کر لیتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ نئی بات کہہ گئے ہیں۔

ریاض خیرآبادی

چھا منا رہ دل جس کی اک لہر نسیم تھی
پیالی بھری کہ اٹھی نگہ انتخاب کی

صد سالہ دورِ چرخ تھا، ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے، تو دنیا بدل گئی

آتے آتے ترے لب تک جو تبسم بن جائے
اس ادا سے کبھی ہم سے بھی ہو پیماں کوئی

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

توبہ سے ڈرایا مجھے، ساقی نے یہ کہہ کر
توبہ شکنی کے لئے، اصرار نہ ہوگا

سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے
چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

کہ ڈھونڈھتا ہوں مگر آشیاں نہیں ملتا
قفس میں جو ٹوٹے تھے، وہ پر نہ نکلے

کہ جن کا شام سے تھا آسرا، اب تک نہیں آئے

جامِ مے توبہ شکن، توبہ میری جام شکن
عالمِ ہُو میں اک آواز سی آجاتی ہے

بہار آتے ہی پھولوں نے چھاؤنی چھائی
نشیمن میں گزرے، کئی موسمِ گل

کیا حسرت سے رخصت صبح کے تاروں کو یہ کہہ کر

ریاض احمد نام، ریاض تخلص، ۱۸۵۳ء / ۱۲۷۰ھ میں خیرآباد ضلع سیتاپور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ بزرگ ایران کے رہنے والے تھے مورثِ اعلیٰ خلجیوں کے عہد میں ہندوستان آئے اور خیرآباد میں سکونت اختیار کی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سید طفیل احمد سے پائی اور شاعری میں اسیر لکھنوی سے فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد امیر مینائی کے شاگرد ہوئے اور استاد کا نام روشن کیا۔ زندگی کا زیادہ حصہ گورکھپور میں گذارا۔ ۱۹۳۴ء / ۱۳۵۲ھ میں خیرآباد میں وفات پائی۔ ریاض پاک نفس، دریا دل اور سچے مسلمان تھے۔ ان کا رندانہ رنگ محض ان کی شاعری تک محدود تھا۔ جو رنگ تغزل میں دیکھا وہ ان کا حال نہ تھا۔ بلا کے پرگو تھے۔ ان کی خمریات کا کیا کہنا انھوں نے شراب اور مضامین شراب کو جس طرح اشعار میں سمویا وہ انہیں کا حصہ تھا۔ ۱۳۶۶ شعر شراب کے لکھے ہیں ان میں سے ہر شعر ایک نئے پہلو کا آئینہ دار ہے۔ ریاض عوام الناس کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام سے ہر استعداد کا آدمی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک خاص لطف ہے جو زبان، انداز بیان کی برجستگی اور جدت طرازی سے پیدا ہوتا ہے۔ ریاض کی شاعری خود ان کی طرح چلبلی، شوخ، آزاد و بیباک ہے۔ اس پر ان کے مخصوص اشارے اور کنائے اور بھی مزہ دیتے ہیں۔

صفی لکھنوی

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

کوئی سیکھ دے دل کی بیتابیوں سے
ہر انجام میں رنگِ آغاز دینا

حُسنِ مجاز چشمِ حقیقت پسند میں
خوش رنگ ہے ضرور، مگر دیرپا نہیں

دیکھ یوں تھک کے نہ بیٹھ اے دلِ حسرت انجام
قدمِ سعی، ابھی سرحدِ آغاز میں ہے

دنیا کا ورق پیشِ اربابِ نظر میں
اک تاش کا پتا ہے کفِ شعبدہ گر میں

دل جب غم پریشاں ہو جمعیتِ ساماں ہے
ہر غنچۂ نورس کی مٹھی میں گلستاں ہے

دل کے اجزائے پریشاں کو حقارت سے نہ دیکھ
کہیں صدیوں میں یہ سرمایہ بہم ہوتا ہے

جونپور! اے مولدِ سلطانِ عادل شیر شاہ
تیرے آثارِ قدیمہ تیری عظمت پر گواہ (نظم)

کہہ رہا ہے قلعۂ شاہی یہ با حالِ تباہ
مدتوں تک ہند کی ہم بھی رہے ہیں تخت گاہ

ایک غافل قوم کی کھوئی ہوئی عظمت ہیں ہم
ہم سے عبرت کا سبق لو، منظرِ عبرت ہیں ہم

سید علی نقی زیدی نام، صفی تخلص، لسان القوم خطاب، ۱۸۶۲ء/۱۲۷۹ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب حضرت زید الشہید بن حضرت امام زین العابدین بن حضرت امام حسین علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ مورثِ اعلیٰ سید نور الدین شاہ مبارک زیدی بعہد سلطان شمس الدین التمش غزنی سے آکر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے لیکن پردادا سید احسان علی دہلی سے فیض آباد چلے گئے۔ والد سید فضل حسین نواب امجد علی شاہ کے ولی عہد شاہزادہ مرزا سلیمان قدر کے اتالیق مقرر ہوئے۔ کیننگ کالجیٹ اسکول لکھنؤ سے انٹرنس پاس کیا۔ ۱۸۹۳ء سے محکمۂ دیوانی میں مختلف عہدوں پر رہ کر ۱۹۲۱ء میں پنشن لی اور ۱۹۵۰ء/۱۳۷۰ھ میں "بزمِ لکھنؤ" کی آخری شمع بجھ گئی۔ صفی ان مبارک ہستیوں میں تھے جنہوں نے لکھنؤ کی اردو شاعری کا رخ بدلا اور غزل کیلئے نئی عمارت تیار کی۔ ان کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا لیکن تلمذ کسی سے نہ تھا۔ ان کی غزلوں میں جدت ضرور ہے لیکن وہ غزل گو شاعر نہیں ہیں۔ ان کی طبیعت کو نظموں سے زیادہ لگاؤ ہے۔ قومی نظمیں بھی خوب کہتے تھے۔ ان کی بیانیہ شاعری کے سلسلے میں وہ نظمیں قابلِ ذکر ہیں جن میں شہروں کے تاریخی مقامات کا بیان اور عمارات کا ذکر ہے۔ ان چیزوں کو وہ دلکش انداز سے بیان کرتے ہیں اور ہو بہو تصویر کھینچ دیتے ہیں۔

سائل دہلوی

سائل تمہارے شعر کی تعریف کیا کریں
مضموں حیا کا ذہن میں سانچے میں ڈھل گیا

نغمۂ بلبل عجب اک دلگداز آواز ہے
اب یہ صاحبِ دل سمجھ لیں سوز ہے یا ساز ہے

پروانے مٹ رہے ہیں تری شمعِ بزم پر
یہ انجمن، اک اور، تری انجمن میں ہے

ایک گلشن میں ہے اک خانۂ صیاد میں قید
گل و بلبل کو میسّر نہیں یکجائی بھی

چارہ گرِ دل کہیں دیتا تو سمجھتا یہ بات
ہچکیاں ہیں کہ یہ آوازِ شکستِ دل ہے

ہوا ہوں اشکِ ندامت سے پاک دامن میں
یہ پانی وہ ہے کہ داغِ گناہ دھوتا ہے

اس خطر سے سائے پیراہن کی کر دیں دھجیاں
اشکِ خوں دامن پہ ٹپکے داغِ رسوائی نہ ہو

ہمیشہ خونِ دل رویا ہوں میں لیکن سلیقے سے
نہ قطرہ آستیں پر ہے نہ دھبا جیب و دامن پر

تیغ نہ تھی، ادا تو تھی، نیتِ قتل کیوں پھری
میں نے یہ کب کہا کہ یوں، میں نے نہیں کہا کہ یوں

شباب کر دیا میرا تباہ، الفت نے
خزاں کے ہاتھ کی بوئی ہوئی بہار ہوں میں

نواب سراج الدین احمد خاں نام، سائل تخلص، ابو المعظم لقب، تاریخی نام "مرزا سراج الدین خاں" ہے یہ نام مرزا غالب نے نکالا تھا۔ اور تخلص نواب غلام حسین خاں محو شاگرد مرزا غالب نے قرعہ اندازی کے بعد رکھا تھا۔ سائل جناب نوابانِ لوہارو کے چشم و چراغ تھے۔ یہ خاندان فضل و کمال کے ساتھ ساتھ دنیاوی وجاہت میں بھی امتیاز رکھتا ہے۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف اور نواب مرزا خاں داغ اسی خاندان میں نامور شعرا گذرے ہیں مرزا غالب کو بھی اس سے نسبتی تعلق ہے۔ ان کے علاوہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں، نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب (سائل کے جدِ امجد و پدر بزرگوار) نواب سعید الدین احمد خاں طالب (سائل کے عمِ محترم) دہلی اور لوہارو کے آسمان پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔

سائل صاحب ۱۸۶۸ء ۱۲۸۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۵ء ۱۳۶۵ھ میں وہیں وفات پائی۔ عربی، فارسی، سنسکرت، علم عروض اور طب میں کافی واقفیت تھی۔ شعر و سخن کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ فصیح الملک داغ کے شاگرد اور داماد تھے خود فرماتے ہیں

ظہیر و ارشد و غالب کا ہوں جگر گوشہ
جنابِ داغ کا تلمیذ و یادگار ہوں میں

سائل کا کلام دلی کی شاعری کا نمونہ ہے۔ معاملہ بندی اور روزمرہ کی گھلاوٹ اُن کے کلام کی خصوصیت ہے۔

امجد حیدرآبادی

جہاں کو ناز ہے ہستی پر اپنی
میں اپنی نیستی پر مر رہا ہوں
ملا ہے جب سے لطفِ خاکساری
تنزل میں ترقی کر رہا ہوں

امجد —— مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۳۷ء

رباعیات:

کس طرح نظر آئے وُہ پردہ نشیں امجد — ہر پردہ کے بعد اور اک پردہ نظر آتا ہے
وُہ کرتے ہیں سب کچھ پر تدبیر اسے کہتے ہیں — ہم دھر لئے جاتے ہیں تقدیر اسے کہتے ہیں

ہیں مستِ مئے شہود تو بھی میں بھی — ہیں مدعیِ نمود، تو بھی، میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں — ممکن نہیں دو وجود، تو بھی، میں بھی

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے — کیا ذکرِ صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی — سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

سید احمد حسین نام، امجد تخلص، ۱۸۶۸ء (۱۲۸۵ھ) میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد دکن وطن ہے۔ والد صوفی سید رحیم علی بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے جن کا انتقال امجد کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ مکتب کی ابتدائی مذہبی تعلیم کے بعد مدرسہ نظامیہ حیدرآباد دکن میں درس نظامیہ کا درس لیا اور مولانا نادرالدین اور نواب آقا سید علی شوشتری جیسے عربی اور فارسی کے علما کی صحبتوں میں ادبی مذاق اور بصیرت کی تکمیل ہوئی۔ ریاست حیدرآباد میں ۳۵ سال تک مددگار محاسب رہے۔ اب وظیفہ حسن خدمت حاصل کر کے پُرسکون زندگی گذار رہے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں رودِ موسیٰ کی طغیانی میں ماں، بیوی اور بچی نذرِ اجل ہوئے۔ اس واقعہ نے امجد کی طبیعت کا رنگ ہی بدل ڈالا اور وہ تصوف کی طرف راغب ہو گئے۔

امجد ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ سادگی، تاثیر اور گداز اُن کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ امجد نے یوں تو نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی مگر اُن کی شہرت کی بنیاد اُن کی رباعیات پر ہے جن میں قرآنی نکات اور حدیثوں کی تضمین ہوتی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اُن کی رباعیات حقائق و معارف، توحید و رسالت، عبادتِ الٰہی، اخلاق و فلسفہ اور تصوف پر تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

فصاحت جنگ جلیل

آنکھوں میں یوں آ کے ابھی نکل گئے
ٹپکی نہیں زمیں پہ اشکِ رواں چلے

نگاہ برق نہیں، چہرا آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

شرابِ عشق کی مستی، عجیب مستی ہے
گیا جو ہوش، تو پھر عمر بھر نہیں آتا

تم آکر سیر تو دیکھو، ہمارے دیدۂ تر کی
کہ موجیں لے رہا ہے آج کل دریا محبت کا

پئے تعظیم دردِ دل جو اُٹھا
مرے دل میں ہوا، کس کا گذر آج

یار تک پہنچا دیا، بے تابیِ دل نے ہمیں
اک تڑپ میں منزلوں کا فاصلہ جاتا رہا

سیر کا لطف، خیالِ گل و گلشن میں رہا
میں قفس میں بھی رہا یوں، کہ نشیمن میں رہا

قاصد پیامِ شوق کو، دینا بہت نہ طول
کہنا فقط یہ اُن سے کہ، آنکھیں ترس گئیں

وُہ اُٹھے، اور درد اُٹھا حشر اُٹھا
مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

نقاب کہتی ہے میں پردۂ قیامت ہوں
اگر یقیں نہ ہو تو دیکھ لو اُٹھا کے مجھے

آتے آتے آئے گا اُن کو خیال
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

جلیل حسن نام جلیل تخلص جلیل القدر فصاحت جنگ خطاب ۱۸۶۹ء / ۱۲۸۶ھ میں اپنے وطن مانک پور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی حافظ عبدالکریم تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فارسی و عربی کی استعداد لکھنؤ میں بہم پہنچائی۔ بیس برس کی عمر میں امیر مینائی کے شاگرد ہوئے اور زیادہ تر اُن کے ساتھ رہے ۱۹۰۰ء میں اپنے استاد کے ہمراہ حیدرآباد دکن گئے ۱۹۰۵ء میں میر محبوب علی خاں مرحوم سابق خسرو دکن نے پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا اور داغ مرحوم کی جگہ اپنی استادی کا شرف بخشا۔ میر عثمان علی خاں نے بھی انہی کو اپنا کلام دکھایا۔

کاروانِ امیر کا یہ آخری مسافر عمر کی ۷۷ منزلیں طے کر کے آخر ۱۹۴۶ء / ۱۳۶۶ھ میں دوسری دنیا کو سدھارا۔ اور حیدرآباد دکن میں سپردِ خاک ہوا۔

حافظ جلیل حسن امیر مینائی کے شاگردِ خاص اور جانشین اور اُردو شاعری میں اپنے استاد کے رنگ کے حقیقی امانت دار تھے۔ اُن کے کلام میں امیر کی ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں اور زبان کے لطف پر اُن کی شاعری کی عمارت قائم ہے

سرورؔ جہان آبادی

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی، یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری، دلِ بے قرار سو جا

محوِ سکوت ہیں لبِ رنگیں نوائے داغ
پھولوں میں اب ہے داغ کہ بوئے قبائے داغ

شب کہ وقفِ بالشِ تمکیں دلِ بے تاب تھا
عالمِ رؤیا میں میں سرمستِ ذوقِ خواب تھا

صد چاک تیرے عشق میں جیبِ قبائے گل
دامن کی ہر کلی میں ہے بوئے وفائے گل

ویرہ ہوتی،
آہ او ننھے سے کیڑے، نازشِ صحرا ہے تو
دشت میں اک سُرخ چھوٹا سا گلِ رعنا ہے تو

برقِ عالم سوز کی ننھی سی ہیکل ہے کوئی
آتشِ یاقوت کی چھوٹی سی منقل ہے کوئی

جلوۂ گل ہے فضائے وادیِ پُر خار میں
سرخ تمغہ ہے قبائے سبزۂ کہسار میں

رنگ آمیزی ہے قدرت کی تری تصویر میں
اک دل آویزی ہے قدرت کی تری تصویر میں

بادۂ گلگوں ترے چھوٹے سے پیمانے میں ہے
عالمِ نیرنگِ افسوں تیرے مے خانے میں ہے

ناز ہے صحرا کو تیری شوخیِ رفتار پر
دوڑتا ہے خوں کا قطرہ سبزۂ کہسار پر

درگا سہائے نام، سرورؔ تخلص، ۱۸۷۳ء / ۱۲۹۰ھ میں پیدا ہوئے۔ جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے ایک معتقد کائستھ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ والد کا نام حکیم پیارے لال تھا۔ تھوڑی سی عمر میں شہرت و ناموری کے آسمان پر چمکے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ مولوی کرامت حسین بہارؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ بعد میں بیانؔ یزدانی کی شاگردی اختیار کی۔ شروع میں وحشتؔ تخلص تھا، پھر سرورؔ رکھ لیا۔ ۱۸۹۹ء سے اُن کا کلام ادبی رسالوں میں شائع ہو کر مقبولِ عام ہونے لگا۔ سرورؔ نہایت اُمنگ کے ساتھ اشعار میں اپنی خوش دلی کا ثبوت دے رہے تھے کہ دفعتاً اُن کے اکلوتے بیٹے کا جسے اُس کی ماں ایک سال کا چھوڑ کر مر چکی تھی انتقال ہو گیا۔ اس حادثۂ جانکاہ نے سرورؔ کی طبیعت میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اُسی وقت سے غم غلط کرنے کے لیے مے نوشی اختیار کی۔ اور آخر میں اس قدر پینے لگے کہ کئی کئی روز تک مدہوش رہتے تھے۔ آخر ۱۹۱۰ء / ۱۳۲۸ھ میں بعمر ۳۷ سال انتقال کیا۔ سرورؔ کو اردو شاعری کے طرزِ جدید کا ایک رکن سمجھنا چاہیے۔ یہ اُن لوگوں میں تھے جنہوں نے غزل کی بجائے نظم کہنی شروع کی۔ اور یوں پُرانی روش سے ہٹ گئے۔ حب الوطنی کے مضامین باندھنے کے علاوہ اُن کی شاعری کی ایک خصوصیت جذبات نگاری اور درد و اثر ہے۔ اُن کے کلام میں سوز و گداز پایا جاتا ہے۔
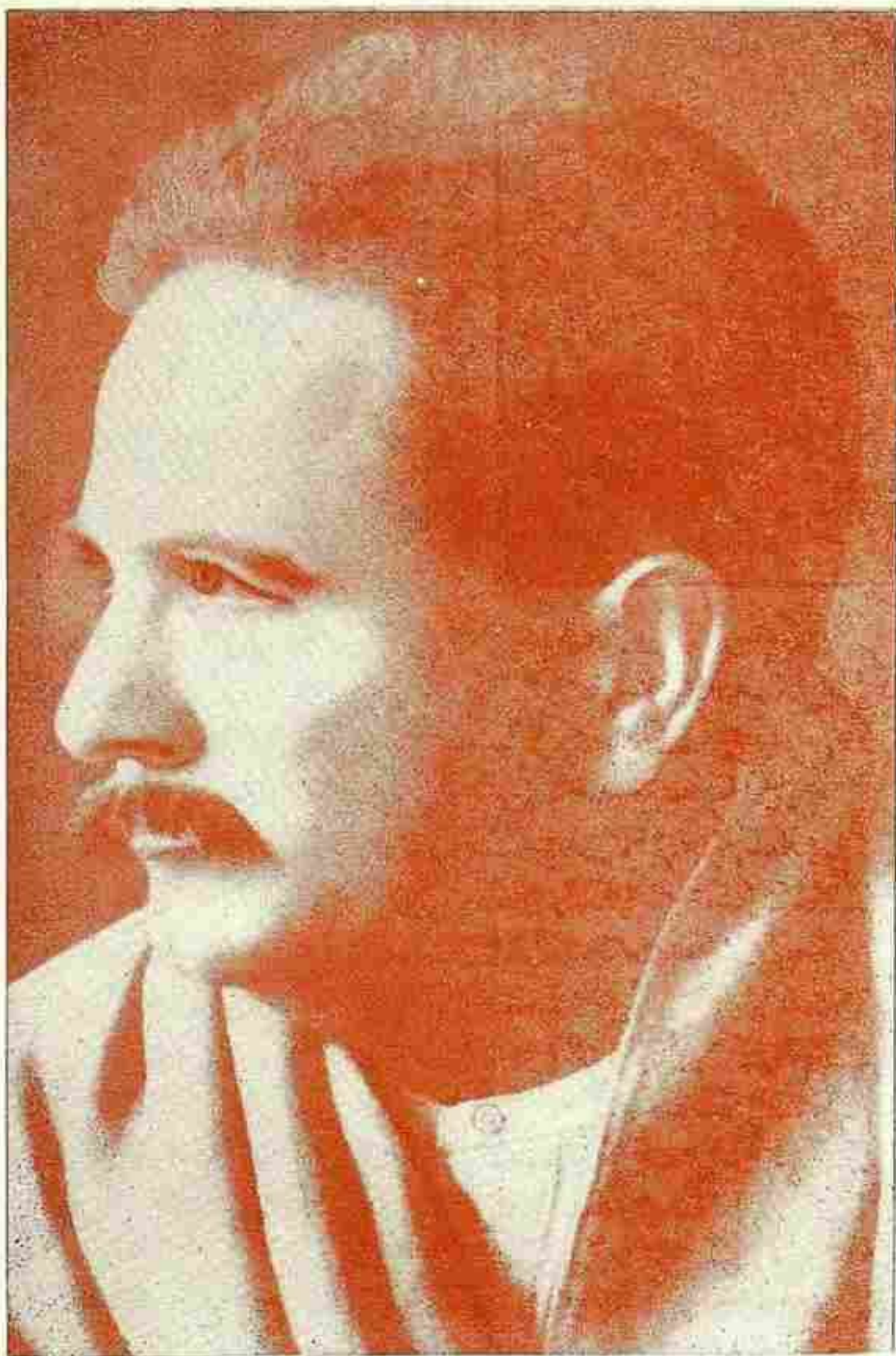
علامہ اقبال

مسلمِ خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ نکل آئی سحر گرمِ تقاضا تو بھی ہو

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں، نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اُٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر، نہ لوں شانِ خداوندی

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

بجلی ہوں، نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

ترے آزاد بندوں کی، نہ یہ دنیا، نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی

محمد اقبال نام، اقبال تخلص ۱۸۷۳ء / ۱۲۹۰ھ میں سیالکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے۔ اقبال کو شمس العلما مولوی سید میر حسن اور پروفیسر آرنلڈ جیسے شفیق استاد ملے جن کے فیضِ تربیت میں اُن کی فطری صلاحیتوں اور ذوقِ علمی کی نشو و نما ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں یورپ گئے اور وہاں سے پی ایچ ڈی اور بیرسٹری کی سندیں حاصل کیں۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ابتداً ارشد گورگانی سے مشورۂ سخن کیا۔ بعد میں مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی۔ بہت جلد اُن کے کلام کا آوازہ بلند ہو گیا۔ دنیا نے "شاعرِ مشرق" "ترجمانِ حقیقت" اور "علامہ" کے خطابات سے نوازا۔ ۱۹۲۳ء میں "سر" کا خطاب ملا۔ اور ۱۹۳۸ء / ۱۳۵۷ھ میں لاہور میں وفات پائی۔

اقبال کی عظیم المرتبت شخصیت کی وسعتوں کا سمیٹنا بڑا مشکل کام ہے۔ وہ ایک بلند پایہ مفکر اور فلسفی بھی تھے، اور اردو فارسی کے قادر الکلام اور بالغ نظر شاعر بھی۔ اُن کی شاعری میں جوشِ قومی ہے، سرود و نغمہ بھی ہے اور آہ و شیون بھی۔ اُن کے کلام میں سبق ہے، پیام ہے، دعوتِ فکر و عمل ہے۔ انھوں نے اُردو زبان کو خیالات اور الفاظ و تراکیب کا بڑا سرمایہ عطا کیا اور زبانِ شعر میں وہ حقائق و معارف بیان کئے جن کو بہت سے لوگ محسوس تو کرتے ہیں مگر کہہ نہیں سکتے

حسرت موہانی

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے
تماشا کامیاب آیا، تمنا بے قرار آئی

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

یہ بھی آدابِ محبت نے گوارا نہ کیا
اُن کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی جاتی

سید فضل الحسن نام حسرت تخلص "امام المتغزلین" خطاب۔ سید اظہر حسن کے صاحبزادے ۱۸۷۵ء / ۱۲۹۵ھ میں موہان ضلع اناؤ (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ جدِ اعلیٰ سید محمود نیشاپوری ہندوستان آئے، اور موہان میں سکونت اختیار کی۔ حسرت کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ کالج سے بی اے کیا۔ یہیں اُن کی شاعری پروان چڑھی۔ مئی ۱۹۵۱ء / ۱۳۷۱ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ مولانا حسرت کو شاعری میں تسلیم لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ تسلیم کا سلسلہ نسیم دہلوی کے توسط سے حکیم مومن خاں تک پہنچتا ہے لیکن حسرت پر اس سلسلے کے علاوہ اور اساتذہ کا بھی اثر پڑا ہے۔ کہتے ہیں کہ

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

حسرت اگر ایک طرف مقتدر سیاستدان تھے تو دوسری طرف اُردو کے مایۂ ناز شاعر اور بالغ نظر نقاد۔ انہوں نے متقدمین و متاخرین شعرائے اردو کے کلام کا نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ ایک خاص ترتیب سے اُن کے کلام کا انتخاب بھی شائع کیا۔ انہوں نے تمام عمر جو کچھ کہا غزل کی حدود کے اندر رہ کر کہا۔ وہ خصوصیت سے عاشقانہ، عارفانہ، اور فلسفیانہ اشعار کہتے تھے اُن کے کلام میں تغزل رنگ پایا جاتا ہے جو دہلی کا طرۂ امتیاز ہے۔ انکی شاعرانہ فطرت نے انکی زندگی پر اور انکے سوانح حیات نے انکی شاعری پر اثر ڈالا ہے۔ وہ اُردو شاعری اور اُردو غزل کے لئے مایۂ ناز ہیں اور شاعری کے جدید انقلاب میں اُن کا بہت بڑا حصہ ہے

فانی بدایونی

اُس کی ہستی سے جُدا میرا وجود اللہ رے وہم
بُلبلہ ہے عینِ دریا، پھر بھی دامن چیدہ ہے

نشانِ مہر ہے ہر ذرّہ، ظرفِ مہر نہیں
خدا کہاں نہ ملا، اور کہیں خدا نہ ملا

بس ایک آہِ جہاں سوز کے اثر تک ہیں
یہ خارِ برق، قفس، دامِ آسماں، صیاد

مری حیات ہے محرومِ مدعائے حیات
وہ رہگزر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا

خدا نے زہر کی تاثیر بخش دی فانی
ترس گئی تھی اثر کو بہت دوا میری

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار ترے
یہی ہے موت، کہ جینا حرام ہو جائے

بھڑک کے شعلۂ گل، تو ہی اب لگا دے آگ
کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

تجلیاتِ وہم ہیں، مشاہداتِ آب و گل
کرشمۂ حیات ہے خیال، وہ بھی خواب کا

تعیّنات کی حد سے گزر رہی ہے نگاہ
بس اب خدا ہی خدا ہے، نگاہ والوں کا

نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں، سو وہ بھی کیا معلوم

شوکت علی خاں نام، فانی تخلص، ۱۸۷۹ء / ۱۲۹۶ھ میں پیدا ہوئے۔ والد شجاعت علی خاں محکمۂ پولیس میں انسپکٹر تھے۔ بزرگ کابل سے شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں دہلی آئے۔ جدِ امجد نواب بشارت خاں صوبۂ بدایوں کے گورنر تھے۔ فانی نے ۱۹۰۱ء میں بریلی سے بی اے کیا۔ پھر علی گڑھ سے وکالت کی ڈگری لی۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ اُن کی زندگی مایوسیوں اور ناکامیوں کی داستان ہے۔ ہمیشہ کشاکشِ حیات سے پریشان رہے۔ ۱۹۴۱ء / ۱۳۵۹ھ میں انتقال کیا۔

فانی ایک وارفتہ مزاج انسان تھے۔ عاشقانہ طبیعت پائی تھی۔ زندگی کی تلخیوں نے انہیں انفرادیت پسند اور حساس شاعر بنا دیا تھا۔ وہ مکمل غزل گو شاعر تھے لیکن اُن کا اندازِ بیان غزل گو شعرا سے بالکل مختلف ہے۔ اُن کے احساس کی شدت کا اثر اُن کی شاعری کے محاسن پر بھی پڑا ہے جس نے اُن کی شاعری کو عام سطحِ تغزل سے بلند کر دیا۔ فانی کا رنج و الم گہرا اور فلسفیانہ ہے۔ اُن کے کلام میں خواہشِ مرگ کی تکرار، فلسفۂ حیات کے سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش، جنون و حکمت، عقل و دل، علم و عشق کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ عام روش سے ہٹ کر انہوں نے قدیم و فرسودہ خیالات میں بھی ایک تازگی پیدا کر دی ہے۔

عزیزؔ لکھنوی

مَیں تو بے ہوش ہوا، ذوقِ نظر سے اپنی
تیری تاثیر تھی، اے جلوۂ جانانہ جُدا

اب بھی زیادہ عالمِ اسباب سے ہے وُہ
جو کچھ کسی کے اُجڑے ہُوئے دِل میں رہ گیا

بسکہ تھی وسعتِ آرائشِ گیتی محدُود
دونوں عالم کو ترے وصل کا ساماں سمجھا

کہہ کے بیمار سے یہ بُجھ گئی شمع
رات ہوتی ہے یوں بسر دیکھو

بے حقیقت دل کی ہستی کو وہ سمجھے تھے مگر
اس لہُو کی بُوند نے عالم، تہ وبالا کیا

ہیں حشر کی حقیقت، اتنی سمجھ رہا ہوں
دونوں جہاں ہوں گے، اُن کا شباب ہوگا

یہ اپنا اپنا مقدر، یہ اپنا اپنا نصیب
زمانے بھر کو ہنسائے، ہمیں رُلائے بہار

دِل کبھی تھا ہمارے پہلو میں
یہ خدا جانے بات ہے کب کی

جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے،
نہ بن پڑتی ہے ہنستے اور نہ روتے

دیکھ کر نظم دو عالم، مجھے کہنا ہی پڑا
یہ سلیقہ ہے کسے انجمن آرائی کا

مرزا محمد ہادی نام، عزیزؔ تخلص، سنہ ۱۸۸۲ء مطابق ۱۳۰۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد مرزا محمد علی ایک زبردست عالم تھے۔ اصل وطن شیراز ہے۔ جدِ امجد مرزا محمد جعفر شیراز سے کشمیر آئے۔ کئی پشتوں سے ان کا خاندان لکھنؤ میں متوطن ہے اور اُس کا شمار شہر کے ذی علم خاندانوں میں ہے۔ عزیزؔ نے عربی اور فارسی کی تعلیم وطن ہی میں پائی۔ شاعری میں صفیؔ لکھنوی سے استفادہ کیا۔ اور اُنیس برس کی عمر میں اچھے شعر کہنے لگے۔ سنہ ۱۹۳۵ء مطابق ۱۳۵۴ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

جدید شاعری کے علمبردار اور غزل کے مصلحین نے لکھنؤ کی پُرانی شاعری پر اثر ڈالا تھا۔ صفیؔ خود اس انقلاب کے بانیوں میں تھے۔ عزیزؔ پر استاد کا اثر پڑا۔ اور اُنہوں نے لکھنؤ کا رنگ چھوڑ کر دِلّی کے رنگ میں شاعری شروع کی۔ وہ لکھنؤ کے اس قسم کے شعراء کے پیش رو ہیں اور عام طور پر اُنھی کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہے۔ اُن کی غزل میں میرؔ اور غالبؔ کی تقلید کے ساتھ ساتھ نئے ماحول اور نئے مذاق کا اثر بھی نمایاں ہے۔ انہوں نے غزل کے علاوہ قابلِ قدر نظمیں اور مرثیے بھی کہے ہیں۔ لیکن قصائد میں زیادہ کامیاب ہیں۔ نئے نئے موضوعات، حسنِ تخیل، نادر تشبیہات و تلمیحات، شکوہِ الفاظ اُن کے قصائد کی جان ہیں۔

اصغر گونڈوی

تیرا سا غرور اور برتری، تیرا سا ناز اور رفعت
پھر کیوں ہر اک کی پستی میں ہے ہر اک عنصر میرا

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں، وہیں صیاد ہوتا ہے

ہاں سینہ گلوں کی طرح چاک کر
دے مر کے ثبوت زندگی کا

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا، اسے غمِ جاناں بنا دیا

اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب لطفِ خواب بھی نہیں، احساسِ خواب ہے

بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا
کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو

آدمی نہیں سنتا، آدمی کی باتوں کو
پیکرِ عمل بن کر، غیب کی صدا ہو جا

وہ شورشیں، نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انہیں، انساں بنا دیا

ایک ایک تنکے پر ہے سوختگی طاری
برق بھی لرزتی ہے، میرے آشیانے سے

شورشِ عندلیب نے روحِ چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس، جو فطرۃً آزاد ہوتا ہے

کہہ کے کچھ لالہ و گل، رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

اصغر حسین نام، اصغر تخلص، ۱۸۸۴ء/۱۳۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ آباو اجداد ضلع گورکھپور کے رہنے والے تھے لیکن ان کے والد منشی تفضل حسین قانون گو نے ملازمت کے ساتھ سکونت بھی گونڈہ میں اختیار کر لی تھی، اس لئے اصغر گونڈوی کہلائے۔ شاعری میں پہلے وحید بلگرامی سے اصلاح لیتے رہے پھر چند غزلیں تسلیم لکھنوی کو دکھائیں چونکہ شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت کا شرف حاصل تھا اس لئے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ حکیمانہ ژرف نگاہی میں بادۂ تصوف کی سرمستی نے مل کر ان کے کلام کو اور غزل گو شعرا کے کلام سے علیحدہ کر دیا ہے۔ ان کی شاعری میں جدت کے ساتھ ساتھ درد و اثر بھی پایا جاتا ہے۔ اصغر ان مبارک ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے غزل کی شاعری میں انقلاب پیدا کیا۔ ۱۹۳۶ء/۱۳۵۵ھ میں الہ آباد میں وفات پائی۔

جگر مُرادآبادی
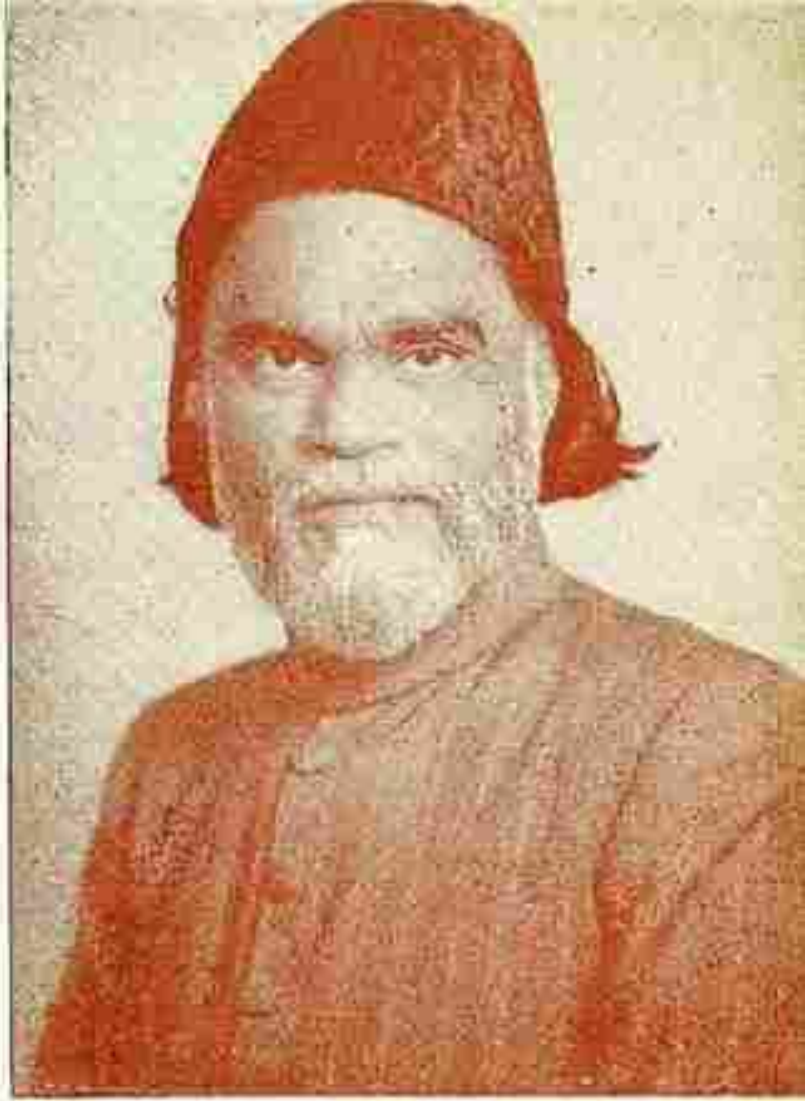
مرے درد میں یہ خلش کہاں، مرے سوز میں یہ تپش کہاں
کسی اور ہی کی پکار ہے، مری زندگی کی صدا نہیں

اے چارہ ساز حالتِ دردِ نہاں نہ پوچھ
اِک راز ہے جو کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

کیا آگیا خیال دلِ بے قرار میں
خود آشیاں کو آگ لگا دی بہار میں

سمجھائے کون بلبلِ غفلت شعار کو
محدود کر لیا ہے چمن تک بہار کو

ہنسی پھر اُڑنے لگی عشق کے فسانے کی — نقاب اُٹھاؤ، بدل دو فضا زمانے کی
حدودِ کوچۂ محبوب ہیں، وہیں سے شروع — جہاں سے پڑنے لگیں پاؤں، ڈگمگائے ہوئے
اِنہیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم — پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے
اے کاش، وہ حسرت زدۂ طور کو ملتی — جس آنکھ سے ہم حُسنِ بُتاں دیکھ رہے ہیں
جینے تک ہیں ہوش کے جلوے، آگے ہوش کی مستی ہے — موت سے ڈرنا کیا معنی، موت بھی جزوِ ہستی ہے
ہر سُو دکھائی دیتے ہیں، وہ جلوہ گر مجھے — کیا کیا فریب دیتی ہے میری نظر مجھے

علی سکندر نام، جگر تخلص، "رئیس المتغزلین" خطاب، سنہ ۱۸۹۰ء / ۱۳۰۸ھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام علی نظر تھا۔ اور نظر تخلص کرتے تھے۔ مُورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع دہلی کے باشندے اور شاہجہان کے استاد تھے۔ عتابِ شاہی کی وجہ سے ترکِ وطن کر کے مراد آباد چلے گئے۔ جگر نے میٹرک تک انگریزی پڑھی ہے۔ شاعری کا ذوق اسلاف سے ورثہ میں ملا تھا۔ رسا کے شاگرد ہیں اور داغ کو بھی کلام دکھایا ہے۔

جگر ایک مکمل غزل گو شاعر ہیں۔ وہ وہی لکھتے ہیں جو محسوس کرتے ہیں۔ وارداتِ حسن و عشق میں ڈوب جاتے ہیں اور کیف، وارفتگی اور بے خودی کی لہروں میں سننے والوں کو بھی بہا لے جاتے ہیں۔ جگر کی شاعری "قال" نہیں سراپا "حال" ہے۔ اور اسی لئے اُس میں زندگی کی تازگی اور حرارت ہے۔ اُن کے کلام کی نمایاں خصوصیت سادگی اور روانی ہے۔ وہ "مُقلد" داغ ہیں۔ غزل کی جدید شاعری میں جن زبردست شخصیتوں نے انقلاب پیدا کیا ہے، اُن میں جگر بہت نمایاں ہیں۔

جوش ملیح آبادی

سمجھ رہا ہے، ما کی عمل، مگر کیا جبر قدرت ہے
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آہی جاتا ہے

بے ہوشیوں نے اور خبردار کر دیا
سوئی جو عقل، روح کو بیدار کر دیا

جس آنکھ کے پردہ میں جھلکتے رہیں آنسو
در اصل وہ سرچشمۂ انوارِ خدا ہے

چشمِ جو اس بند ہے، مست ہوں سوز و ساز سے
ملنے چلا ہوں اس طرح جشنِ جنوں نواز سے

فنا ہو جا، جھلک اٹھے گا سینہ نورِ عرفاں سے
ابھی تو دل کے آئینے پہ، غافل، داغِ ہستی ہے

نظم:

مگر راتوں کو جب فکرِ وطن میں سر جھکاتا ہوں
فضائے سرد میں دھیمی سی اک آواز پاتا ہوں

یہ آواز اس لطافت سے مرے کانوں میں آتی ہے
صبا جس طرح، زیرِ شاخِ سنبل گنگناتی ہے

فضا میں جس طرح "روح الامیں" کی بال جنبانی
برستا ہو کہیں کچھ دور، جیسے خواب میں پانی

جگاتی ہے سحر جس ناز سے نغموں کو دریا میں
ہوا کی سنسناہٹ جس طرح، گنجانِ صحرا میں

حقیقت کیا بتاؤں، اس صدائے روح افزا کی
نہاں ہیں جس کے اندر کاوشیں امروز و فردا کی

یہ مشرق محو ہے، صبحِ تجلی زار ہونے میں
یہ روحِ ایشیا مصروف ہے بیدار ہونے میں

شبیر حسن خاں نام، جوش تخلص، شاعرِ انقلاب خطاب، ملیح آباد وطن، سنہ ۱۸۹۴ء / ۱۳۱۲ھ میں پیدا ہوئے بزرگ کابل سے ہندوستان آئے تھے۔ والد بشیر احمد خاں بشیر اور دادا نواب محمد احمد خاں احمد دونوں صاحبِ دیوان تھے۔ جوش کے پردادا نواب حسام الدولہ تہور جنگ فقیر محمد خاں گویا (شاگردِ ناسخ) کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے جوش کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر کچھ عرصہ تک چند اسکولوں میں تعلیم پائی سنہ ۱۹۲۴ء میں حیدر آباد دکن گئے اور دس سال تک عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ میں ملازمت کی جوش نے بچپن سے شعر کہنا شروع کیا۔ اور عزیز لکھنوی سے اصلاح لی کچھ عرصہ تک غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کرتے رہے اس کے بعد اپنی توجہ نظم کی طرف مبذول کر دی جوش کی شاعری، ان کے کردار و سیرت کا آئینہ اور خود ان پر گذری ہوئی کیفیتوں کا مرقع ہے "شباب" ان کا خاص موضوع ہے ان کو زبان پر پوری قدرت ہے۔ ان کے کلام میں اگر ایک طرف غنائی شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں تو دوسری طرف انقلابی اور خصوصاً اشتراکی عنصر آب و تاب سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔

رضا علی وحشت

پھر کرے تازہ کشش پیدا حرم میرے لیے
محو آرائش ہے پھر بیت الصنم میرے لیے

خود بخود محسوس کی میں نے بھی اپنی تابِ ضبط
جب گراں ہونے لگا بارِ الم میرے لیے

تیرے ہی ذوقِ جلوہ سے وا ہو گئی ہے چشم
یاں ورنہ امتیازِ وجود و عدم نہ تھا

میں سادہ لوح واقفِ رسمِ بتاں نہ تھا
اقرارِ عشق کر کے گنہگار ہو گیا

زبانِ بے زبانی کہہ رہی ہے داستاں میری
شکایت سنج ہوں میں کس کے جورِ بے نہایت کا

کچھ کام لے سکے نہ کبھی جستجو سے ہم
شرمندہ ہی رہے ہیں تری آرزو سے ہم

عالم یہ ہے چھایا ہوا اک یاس کا عالم
یعنی کہ تمنا کے گرفتار بہت ہیں

انداز میں، شوخی میں، شرارت میں، حیا میں
واں ایک نہ اک بات نکلتی ہی رہے گی

ہزاروں حسرتوں کا نقش ہے آئینۂ دل پر
مرا سینہ ہے یا اک حیرت آبادِ تمنا ہے

رضا علی نام، وحشت تخلص ۱۸۸۱ء (۱۲۹۸ھ) میں بمقام کلکتہ پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی شمشاد علی۔ دادا حکیم غالب علی غدر ۱۸۵۷ء میں دہلی سے کلکتہ چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وحشت کو شعر و شاعری سے فطری ذوق تھا۔ فصیح الملک داغ دہلوی کے شاگرد اور مولوی عبدالغفور نساخ کے بیٹے مولوی ابوالقاسم سے تلمذ کیا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے امپیریل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ کلکتہ میں ملازم ہوئے۔ اُس کے بعد اسلامیہ کالج کلکتہ میں اُردو کے پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء میں خان بہادر کا خطاب ملا اور ۱۹۳۶ء میں پنشن ہو گئی۔ تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے بعد کلکتہ سے ڈھاکہ چلے گئے۔

وحشت نے طرزِ غالب اختیار کرنے میں جو کمال دکھایا، اُس کو مولانا حالی کی زبان سے سنئے "وحشت نے میرزا غالب کے تتبع کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔" مولانا شبلی فرماتے ہیں "وحشت کے کلام میں جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔ غالب اور مومن کی ترکیبیں اور طرزِ ادا اُن سے خوب بن پڑتی ہے۔" جہاں تک بیان اور انداز خیال کا تعلق ہے، وحشت نے بیشک طرزِ غالب کا صحیح چربہ اتارا ہے۔ اور اُن کے کلام میں اسی انداز کی فارسی ترکیبیں پائی جاتی ہیں جن سے غالب کا نام روشن ہے۔ علوئے تخیل اور مضامین کی نزاکت میں غالب کی ہمسری کا دعویٰ تو انہیں بھی نہیں وہ صرف اس رنگِ خاص کے مقلد اور خاصے کامیاب مقلد ہیں۔ یہ چیز بجائے خود قابلِ تحسین ہے۔

حفیظ جالندھری

تبسّم ہی تبسّم تھے نظارے لالہ زاروں کے
ترنّم ہی ترنّم تھے کنارے جوئباروں کے
ندا آئی دریچے کھول دو ایوانِ قدرت کے
نظارے خود کرے گی آج قدرت شانِ قدرت کے
ہوا عرشِ معلّٰی سے نزولِ رحمتِ باری
تو استقبال کو اُٹھی حرم کی چار دیواری
مبارک ہو کہ ختم المرسلیںؐ تشریف لے آئے
جنابِ رحمۃٌ للعالمیںؐ تشریف لے آئے
بصد اندازِ یکتائی، بغایت شانِ زیبائی
امیں بن کر امانت، آمنہ کی گود میں آئی

(شاہنامۂ اسلام)

نہ کوئی زعمِ باطل تھا نہ کوئی جوششِ ہنگامی
نہ فکرِ کامیابی تھی نہ ذکرِ خوفِ ناکامی
نہ کثرت کی کوئی پروا، نہ قلت کا تھا غم اُن کو
نہ کچھ اندیشۂ پست و بلند و بیش و کم اُن کو
نہتّے تھے مگر تسکین و اطمینان رکھتے تھے
کہ ساماں پر نہیں، ایمان پر ایمان رکھتے تھے

(غزل)

معصوم امنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولوں میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہے

ہم تری صورتِ انکار کو پہچانتے تو ہیں
وہ تبسّم تو شریکِ لبِ گویائی کر

محمد حفیظ نام، حفیظ تخلص، کنیت ابوالاثر۔ سنہ ۱۹۰۰ء/۱۳۱۸ھ میں پنجاب کے قدیم شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان قدیم چوہان سورج بنسی راجپوت خاندان کی ایک شاخ ہے جو دو سو سال قبل مسلمان ہو گیا تھا۔ حفیظ کی ابتدائی تعلیم جالندھر میں ہوئی۔ بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ مولانا غلام قادر گرامی سے اصلاح لی۔ ۱۹۲۵ء میں پہلا مجموعہ "نغمہ زار" اُن کی شہرت کا باعث ہوا۔ "سوز و ساز" اور "تلخابۂ شیریں" بعد کا کلام ہے۔ حفیظ کا سب سے بڑا کارنامہ "شاہنامۂ اسلام" ہے۔

حفیظ نے مختلف حیثیتوں سے اُردو شاعری کو متاثر کیا ہے۔ موضوعِ کلام، مضمون و خیالات، بحور و قوافی، منظر کشی کا انداز، مناظر کا تجزیہ، تشبیہات و تلمیحات کے اعتبار سے اُن کی شاعری میں ایک نرالا پن ہے۔ انھوں نے اگر ایک طرف "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" میں چھوٹی چھوٹی بحروں میں جذبات کے اظہار اور دردِ دل کی ہلکی دھنوں اور گیتوں کو سانچے میں ڈھالا تو دوسری طرف "شاہنامۂ اسلام" کی شکل میں واقعہ نگاری اور بیانیہ شاعری کا ایک عمدہ نمونہ پیش کیا۔ وہ ہندی بحروں کو اُردو میں رائج، اور شعر میں الفاظ کی نشست اور ترکیبوں سے ترنّم اور حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حفیظ بیک وقت "شاعرِ شباب" بھی ہیں اور "مرقع نگار" بھی

اختر شیرانی

پلائے جائیے جا خوب ساقی!
کہ ہستی ہے سراسر اتفاقی

چھلک جائے نہ مینائے دو عالم
ہمارا ہات ہے اور زلفِ ساقی!

اختر شیرانی ۱۲-۳-۴۷

خدائی کہکشاں کہتی ہے جس کو
وہ سلمیٰ کا خرام رائیگاں ہے

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے

مجھے مے خانہ تھراتا ہوا محسوس ہوتا ہے
وہ میرے سامنے شرما کے جب پیمانہ رکھتے ہیں

ہے جام خالی تو پھیکی ہے چاندنی کیسی
یہ سیلِ نور تم ہے شراب ہو نہ سکا

چمن کی ہر کلی سے نور کی مستی چھلکتی ہے
در و دیوار سے مہتاب کی شوخی جھلکتی ہے

یہ بھیگی رُت، یہ مستانہ ہوا، برسات کا موسم
بہاروں کا سماں، یہ رس بھرے جذبات کا موسم

ہیں بحر مے سے بہم میکدے میں شام و سحر
کہ ماہتاب قدح، آفتاب ہے ساقی

نام محمد داؤد خاں، تاریخی نام مسعود خسرو۔ اختر شیرانی کے نام سے دنیائے شاعری میں مشہور ہیں۔ ۱۹۰۵ء ۱۳۲۳ھ میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۸ء ۱۳۶۸ھ میں بمقام لاہور انتقال ہوا۔ والد کا نام حافظ محمود خاں شیرانی۔ بزرگ صوبہ سرحد سے آئے تھے دادا مولوی محمد اسمٰعیل خاں ٹونک کے نواب محمد علی خاں کے مختار تھے۔ ابتدائی تعلیم ٹونک میں پائی مزید تعلیم کیلئے لاہور آئے کیونکہ ان کے والد یہاں پروفیسر تھے اختر کا بیشتر زمانہ لاہور ہی میں گذرا یہیں سے بہارستان، خیالستان اور رومان ادبی رسائل نکالے ۱۹۳۶ء میں اردو کی مشہور لغت "جامع اللغات" کی ادارت کی۔

اختر شیرانی کی شاعری فلسفہ و تصوف کے بجائے عشق مجازی کے لطیف جذبات اور وجد انگیز غنائیت سے معمور ہے۔ وہ ایک رومانی شاعر ہیں اور ان کی تمام شاعری پر جوانی چھائی ہوئی ہے۔ ان کی شاعری کی روح تغزل ہے اور وہ اس روحِ تغزل اور غنائیت کو اپنی تمام شاعری پر پھیلا کر الفاظ کی ترکیب اور اپنی انفرادی رنگینی سے کلام میں عجیب ولولہ انگیز ترنم اور نغمگی پیدا کر دیتے ہیں۔

نور آرٹ پریس گنپت روڈ۔ انار کلی۔ لاہور

فصیح الملک
شیخ ابراہیم ذوق
اسد اللہ خان غالب
داغ دہلوی
اکبر الہ آبادی
صفی لکھنوی
محمد اقبال
حسرت موہانی
اصغر
حفیظ